پریم پال اشک

رتن ناتھ سرشار

حیات، شخصیت اور کارنامے

سلسلہ مطبوعات

اردو کے عظیم ادیب

رتن ناتھ سرشار

حیات، شخصیت اور کارنامے

مصنف

پریم پال اشک

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔1۔ آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی110066

Ratan Nath Sarshar

By

Prem Paul Ashk

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1982

دوسرا اڈیشن : 2000 تعداد 1100

قیمت : =/17

سلسلۂ مطبوعات : 265

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : فہمی کمپیوٹرس دین دنیا ہاؤس جامع مسجد دہلی-6

پیش لفظ

پیارے بچو! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے کائنات میں نیک و بد کی تمیز آجاتی ہے۔اس سے کردار بنتا ہے اور شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے، یہ سب ہونے کے بعد زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔اس لیے کسی بھی زبان کا ادب خواہ انگریزی ہو یا سندھی، اردو ہو یا ہندی، ادب کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ہمارا بچوں کا ادب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ ہماری کتابوں کا مقصد تمہارے دل ودماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات اور نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے۔اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جن سے تم سبق حاصل کر سکو اور اپنے لیے منزلیں متعین کر سکو۔ یاد رکھو اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھاؤ۔ تاکہ اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں ہمارا ہاتھ بٹا سکو۔اسی لیے قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے۔اپنے پیارے بچوں کے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی و دیدہ زیب کتابیں شائع کر رہا ہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

پہلا باب
پنڈت رتن ناتھ سرشار
زندگی، شخصیت اور کارنامے
دوسرا باب
سرشار کی تصانیف
تیسرا باب
سرشار کا فن
چوتھا باب
سرشار کی ادبی خدمات اور ان کا مرتبہ
ضمیمہ
سرشار کی تحریروں کے نمونے
کتابیات

پہلا باب

پنڈت رتن ناتھ سرشار

(زندگی۔شخصیت اورنظریات)

حالاتِ زندگی

پنڈت رتن ناتھ در کاشمیری برہمن تھے۔اُن کا تخلص سرشار تھا۔ وہ پنڈت بیج ناتھ در کشمیری کے صاحبزادے تھے۔ وہ تجارت کے سلسلے میں لکھنؤ آبسے تھے۔ اُن کا شمار لکھنؤ کے معزز شہریوں میں ہوتا تھا۔ رتن ناتھ سرشار کے چھوٹے بھائی پنڈت بشمبر ناتھ در اور بیٹے نرنجن ناتھ در سرکاری خزانے میں ملازم تھے۔

سرشار ۵؍جون ۱۸۴۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ نواب امجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔

سرشار چار سال کے تھے کہ اُن کے والد کی وفات ہوگئی اور پھر اُن کی والدہ نے اُن کی پرورش کی۔

کہتے ہیں سرشار بچپن ہی سے بہت شوخ اور چنچل تھے۔ ذہانت اور زبان کی تیزی اور طرّاری نے جلد ہی اپنا رنگ دکھلایا جس مکان میں رہتے تھے وہاں مسلمان خواتین بھی رہتی تھیں۔ وہ

اُن کے یہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے اردو انھیں خواتین سے سیکھی۔ انھیں کے مہذّب اور شائستہ ماحول میں کم سنی ہی میں تعلیم حاصل کی۔ اُن کے طرزِ معاشرت کو قریب سے دیکھا اور اپنے ذہن میں سمونے کی کوشش کی۔

سرشار بڑے ہوئے تو انھیں عربی اور فارسی تعلیم کے لیے لکھنؤ کے مکتب میں بھیج دیا گیا۔ چونکہ وہ نوابی عہد تھا۔ اس لیے انھیں تعلیم بھی قدیم دستور کے مطابق دی گئی۔

جب سلطنتِ اودھ کی بساط اُلٹ گئی اور انگریزی حکومت کا دور آیا تو لکھنؤ میں انگریزی تعلیم کے لیے کیننگ کالج قائم ہوا۔ یہ لکھنؤ کا بہترین کالج تھا۔ یہ کالج وہیں قائم تھا جہاں آج کل لکھنؤ یونیورسٹی ہے۔ سرشار اُسی کالج میں داخل ہوئے۔ مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کرسکے۔ چونکہ اُن کی طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے وہ عجیب انداز سے کلاس میں داخل ہوتے تھے۔ سر ننگا ہوتا۔ بال بکھرے ہوتے اور اچکن کے بٹن کھُلے رہتے۔ غرضیکہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل نہ کرسکے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے انگریزی ادب کا اچھا مطالعہ کیا۔ اور اسی کالج سے انگریزی علم کا ایک وافر ذخیرہ اپنے ذہن میں لے کر نکلے۔ جب سرشار بالغ ہوئے تو روزی کمانے کا کوئی وسیلہ ضرور ڈھونڈنا تھا۔ کھیری کے ضلع اسکول میں ایک استاد کی جگہ خالی تھی۔ انھوں نے مدرسی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ لیکن وہ وہاں زیادہ عرصہ ملازمت نہ کرسکے۔ چند برس کے بعد مدرسی کا پیشہ ترک کردیا اور اپنے انداز

سے علم وادب کی خدمت شروع کردی۔

۱۸۷۶ء میں جب وہ کھیری کے اسکول میں ٹیچر تھے تو انھوں نے اودھ پنچ کے لیے مضامین بھیجنے شروع کردیے۔ اُس زمانے میں نئے ہندوستان کی تعمیر ہورہی تھی۔ نوابی عہد ختم ہوچکا تھا اور انگریز اپنے قدم آہستہ آہستہ مضبوط کررہے تھے۔ ہرطرف اصلاحات کا دَور دَورہ تھا۔ نئی نئی سائنسی ایجادات عمل میں آرہی تھیں اور نئے نئے رسالے اور اخبارات جاری ہورہے تھے۔ اُردو زبان اور ادب پر بھی انگریزی زبان کا اثر ہورہا تھا۔ سرشار بھی اس اثر سے نہ بچ سکے اور انھوں نے ۱۸۷۶ء میں جب وہ کھیری کے ضلع اسکول میں ٹیچر تھے۔ تو وہیں سے سائنسی اور تعلیمی موضوعات پر مضامین لکھ لکھ کر بھیجنے شروع کردیے۔ اُن کا پہلا مضمون کشمیری پنڈتوں کے ایک رسالہ مراسلۂ کشمیری میں شائع ہوا۔ اِس رسالے میں قومی اور سماجی اصلاح پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

یوں تو نثر کے میدان کے مرد اُس وقت رجب علی بیگ سرور ہی تھے جن کے مسجع اور مقفیٰ انداز نے دلبستانِ لکھنؤ پر ہی نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا پر اپنا جادو کر رکھا تھا۔ سرشار بھی سرور کے اس جادو سے نہ بچ سکے اور انھوں نے شروع میں انھیں کے انداز میں مضامین لکھے مگر کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے اپنا مخصوص اسلوب اپنا لیا اور اُردو ناول نویسی میں ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہوئے۔ اُن دنوں مراسلۂ کشمیری کے علاوہ مراۃ الہند اور ریاض الاخبار بھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کے مضامین سے فیض یاب ہوتے تھے۔ پنڈت جی

کا مضمون نگاری کا ذوق دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ چونکہ اُن دنوں فارسی زبان کا چلن تھا۔ اس لیے پنڈت جی نے مراسلۂ کشمیر کے لیے دو فارسی مضامین بھی اشاعت کی غرض سے روانہ کیے تھے اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرشار کے لیے طرزِ تحریر کی ابتدا دراصل اودھ پنچ سے ہوئی تھی۔

اُس زمانے میں اتر پردیش کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک اخبار شائع ہوا کرتا تھا۔ اُس میں علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ سرشار نے اپنے زورِ قلم سے ترجمہ کے فن میں بھی اپنی اعلا قابلیت، مہارت اور دسترس کا ثبوت دیا۔ ترجمہ نگاری کے فن میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے منتظمِ اعلا نے اپنی سالانہ رپورٹ میں اس امر کا اعلان کیا کہ جیسا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ پنڈت رتن ناتھ سرشار صاحب کا ہوتا ہے اور کسی دوسرے شخص کا صوبے بھر میں نہیں ہوتا۔ ایک بات اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ سرشار کی ادبی زندگی کی ابتدا مترجم کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ انھوں نے سائنس سے متعلق کئی مضامین کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں سلیس اور بامحاورہ زبان میں کیا تھا۔ لیکن اُن کی ادبی زندگی کی حقیقی معنوں میں ابتدا ۱۸۷۸ء میں ہوئی۔ جب کہ انھوں نے طبعیات (فزکس) اور جغرافیہ کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے برف، ابر، پانی کی نسبت اور ساخت بیان کی ہے اور زمین کی کیفیت چاند ستاروں اور سورج کا حال بھی بیان کیا

ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا نام شمس الضحیٰ رکھا۔ ایسے کٹھن اور دقت طلب موضوع کو اُردو زبان میں منتقل کردینا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ اُن دنوں اُردو زبان کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ کارنامہ بخوبی انجام دیا۔ عام فہم اور سلیس انداز میں کیا گیا اُن کا یہ ترجمہ کافی مقبول ہوا۔ اس زمانے میں سرشار کے کام کی اُردو دنیا میں دھوم مچ گئی۔ منشی نول کشور مرحوم لکھنؤ میں اعلا درجے کی اُردو اور فارسی کتابیں شائع کرتے تھے۔ شمس الضحیٰ بھی انھوں نے ہی شائع کی۔ اُن دنوں انھوں نے اودھ اخبار کے نام سے ایک روزنامہ شروع کیا اور اُس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لیے سرشار کو دعوت دی تھی۔ اُس سے پہلے وہ منشی سجاد حسین کے اخبار اودھ پنچ کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے۔

اس زمانے میں سرشار مالی پریشانیوں میں گرفتار تھے اور کھیری کے اسکول کی ملازمت چھوڑ چکے تھے۔ اب اُن کے دن اکثر دوستوں کی صحبت میں گزرتے تھے۔ آخر محکمۂ تعلیم کے مہتمم اعلا کے ایما سے منشی نول کشور خود سرشار سے ملنے اور انھیں اودھ اخبار کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ سرشار پہلے تو ذرا جھجکے لیکن مالی پریشانیوں اور دوستوں کے اصرار پر یہ پیشکش قبول کرلی اور منشی نول کشور کے یہاں کام کرنے لگے۔ منشی نول کشور پہلے انھیں ماہانہ تنخواہ دیتے تھے لیکن بعد میں کام کے مطابق معاوضہ دینے لگے۔

شروع میں تو اودھ اخبار میں علمی اور فنی مضامین شائع ہوتے رہے اور ساتھ ہی منشی جی نے سرشار سے مختلف علمی اور فنی کتابوں

کا ترجمہ کرانا شروع کردیا۔ اس دوران سرشار نے میکینزی والیس کی شہرۂ آفاق کتاب روسو کا اُردو ترجمہ " اعمال نامہ روس" کے عنوان سے کیا۔ یہی نہیں بلکہ سرشار نے اسپین کے مشہور ناول نگار واٹس کے شہرۂ آفاق ناول "ڈان کوئزٹ" کا ترجمہ "خدائی فوجدار" کے عنوان سے اودھ اخبار میں قسط وار شائع کیا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ختم ہوگیا۔

خدائی فوجدار کے بعد سرشار نے اودھ اخبار میں " فسانۂ آزاد" شائع کرنا شروع کردیا۔ یہ ناول دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک مسلسل ایک سال تک قسط وار شائع ہوتا رہا اور ۱۸۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اُس ناول کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس کے پیشِ نظر سرشار کے عزیز ترین دوست بھی حسد کی آگ میں جل اُٹھے۔ اشارہ منشی سجاد حسین کی طرف ہے۔ انھوں نے اودھ پنچ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول کے دوسرے اسقام کے علاوہ اُن کی زبان پر بھی شدید اعتراضات شائع کیے۔ مگر سرشار نے اُن سب کا دندان شکن جواب دیا۔ اُس کے بعد کچھ عرصہ تک سجاد حسین اور سرشار کے تعلقات کشیدہ رہے لیکن پھر دل صاف ہوگئے اور پرانی دوستی دوبارہ قائم ہوگئی۔

فسانۂ آزاد کے بعد رتن ناتھ سرشار نے اودھ اخبار کے لیے بہ یک وقت دو ناول لکھے۔ " سیرِ کہسار" اور " جامِ سرشار"۔ " سیرِ کہسار" " فسانۂ لطیف" اور " جامِ سرشار" " فسانۂ جدید" کے عنوان سے اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوتے رہے۔

جب سرشار اودھ اخبار میں فسانۂ آزاد لکھ رہے تھے تو ایک بار وہ منشی نول کشور کے رویّے سے پریشان ہو اُٹھے اور اسی پریشانی کے عالم میں انھوں نے "فسانۂ آزاد" کے اہم کردار ہمایوں فر کو قتل کر ڈالا۔ لیکن بعد میں منشی جی سے سمجھوتہ ہونے پر اُسے ڈرامائی انداز سے دوبارہ زندہ کر دیا۔

آخر سرشار منشی جی کے رویّے سے ازحد نالاں ہو گئے کیونکہ انھیں باقاعدہ تنخواہ تو ملتی نہ تھی۔ وہ توڑ توڑ کر پیسے دیتے تھے۔ اِس لیے سرشار نے مختلف ناشروں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا اور اُن کے لیے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے شروع کر دیے جنھیں اُردو کے ابتدائی ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔

اب تک سرشار ایک بہت بڑے عذاب میں گرفتار ہو چکے تھے یعنی انھیں شراب نوشی کی بُری لت پڑ گئی تھی اور آخر یہی اُن کی کمزوری بن گئی۔ منشی نول کشور نے اُن کی اِس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اُن سے صرف ایک ٹھرّے کی بوتل پر بھی ناول لکھوائے۔ سرشار منشی جی کی اِس چال کو سمجھ گئے اور اُنھوں نے اودھ پنچ کی ملازمت ترک کر دی۔

اِس کے بعد سرشار نے لکھنؤ کے مختلف ناشروں کے لیے ناول لکھے۔ اسی دوران انھوں نے جوبلی پرنٹنگ پریس، اصح المطابع اور شمس المطابع سے رابطہ قائم کر لیا اور ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۸۹۵ء تک انھوں نے فری لانسر کے طور پر کام کیا۔ اور "ہشو" "پی کہاں" "کامنی" "پدمنی" "کرم دھم" "الف لیلیٰ" اور

"رنگے سیار" کے عنوان سے ناول اور ناولٹ لکھے۔ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں جوبلی پرنٹنگ پریس کے مالک ڈاکٹر سی۔سی۔ گھوش کے لیے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس کا نام "خم کدۂ سرشار" تھا۔ یہ رسالہ ہر پندرہ روز بعد منظرِ عام پر آتا تھا۔ اس میں سرشار کے ناولٹ شائع ہوتے تھے۔ اس میں سب سے پہلا ناولٹ "کڑم دھم" شائع ہوا۔ اس رسالے کی قیمت آٹھ آنے یعنی پچاس پیسے تھی اور یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ سرشار کے ناولٹ کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

اِن تصانیف کی ادبی اہمیت تو بس برائے نام تھی۔ لیکن اُن سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ادیب کی زندگی نقطۂ عروج سے نقطۂ زوال کی جانب کس طرح مائل ہوتی ہے۔ سرشار نے ۱۸۹۲ء میں مدراس میں منعقدہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔

سرشار ایک اچھے شاعر بھی تھے شاعری میں وہ منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے۔ انھیں اپنے استاد سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ وہ اکثر مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے لکھنؤ کے مشاعرے میں یہ شعر پڑھا تھا ؎

حال سب میری سخت جانی کا
بالتفصیل کہتی ہے مُڑ کے خنجر سے

اس شعر کے باعث انھوں نے پورا مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔

اکتوبر ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں کشمیری پنڈتوں کی ایک کانفرنس

منعقد ہوئی تھی۔ اُس میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ایک قصیدہ "طوفانِ سرشار" پڑھا تھا۔ اُس قصیدے میں کشمیری پنڈتوں کی حالتِ زار کا ذکر تھا۔ اور پوری قوم کو بیدار ہونے کی تلقین اور سماج سے تمام قباحتیں دور کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اسی اثنا میں اُن کے ایک عزیز ترین دوست پنڈت بشن ناتھ درآبر انگلینڈ سے بیرسٹری کرکے اپنے وطن آئے تو اُن کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اس میں سرشار نے ایک مثنوی "تحفۂ سرشار" پڑھی تھی۔ بقول لالہ سری رام مصنّف "خم خانۂ جاوید" اس مثنوی سے ولایت کے سفر کا جواز پیدا کرنے میں آسانی ہوگئی۔

سرشار ۱۸۹۵ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد وزیر اعظم نواب حیدرآباد کے ایما پر حیدرآباد چلے گئے۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ مگر دفتری ماحول کی سختی اور کڑے قاعدے قانون انھیں راس نہ آئے اور وہ حیدرآباد سے چلے گئے۔ نظام حیدرآباد نے انھیں اپنے معزز درباریوں میں شامل کیا اور مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ۲۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ اور اپنا نثری اور شعری کلام انھیں اصلاح کے لیے دکھلانے لگے۔

سرشار نے حیدرآباد سے مہاراجہ صاحب کی زیر سرپرستی ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" بھی نکالنا شروع کیا۔ اس میں عمدہ مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار مہاراجہ صاحب سے بدظن ہوکر لکھنؤ لوٹ آئے تھے۔ لیکن بعد میں مہاراجہ صاحب نے

انہیں پھر بلایا۔ حیدرآباد میں سرشار بیمار رہنے لگے۔ اُن کا معدہ اور جگر دونوں خراب ہو گئے تھے اور پیچش میں مبتلا رہنے لگے تھے۔ مہاراجہ صاحب کے یونانی دواخانہ سے اُن کا علاج ہونے لگا لیکن دراصل اُن کی بداعتدالیاں اور لاپروائیاں ان کی صحت کو تباہ کرنے لگیں۔ اس میں شراب نوشی کو بھی بہت دخل تھا۔ اسی لیے مہاراجہ سرکشن پرشاد نے تنگ آکر اُن کے سر سے اپنا دستِ شفقت اٹھا لیا۔ آخری عمر میں اُن کی رسائی ایک دوسرے رئیس تک بھی ہو گئی تھی۔ مگر یہاں بھی انھیں ناکامی و نامرادی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔

سرشار نے اپنی زندگی کا آخری دَور بڑی کس مپرسی کے عالم میں گزارا۔ دربار کی سرپرستی بھی جاتی رہی تھی۔ ازحد شراب نوشی کے باعث وہ بیمار رہتے تھے۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ وہ بستر سے لگ چکے تھے۔

آخر ۲۷؍جنوری ۱۹۰۲ء کو اُردو کے اِس عہدآفریں ناول نگار اور صحافی نے نہایت زبوں حالی کے عالم میں دم توڑا۔ انھوں نے حیدرآباد میں وفات پائی اور وہیں انھیں سپردِ آتش کیا گیا۔

شخصیت

شکل و شباہت

سرشار کا قد لمبا تھا۔ وہ تقریباً چھ فٹ کے تھے۔ چہرا ابھرا ابھرا اور گول تھا۔ مونچھیں بڑی بڑی، جسم توانا، چھاتی چوڑی، بدن دُہرا

اور بازو لمبے لمبے تھے۔ وہ بلا کے ہنسوڑ تھے۔ سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ روتوں کو ہنسانا تو اُن کا شعار تھا۔ کہتے ہیں کہ بذلہ سنجی اور ظرافت میں اُن کا کوئی ثانی کم از کم لکھنؤ میں تو موجود نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ اُن کی شکل و شباہت دراصل اُن کے اپنے مشہور ناول فسانۂ آزاد کے ہیرو میاں آزاد سے بہت ملتی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ سرشار نے میاں آزاد کے روپ میں اپنا کردار ہی پیش کر دیا تھا۔

لباس

سرشار ہمیشہ قمیض اور اُس پر کبھی کبھی اچکن یا لمبا کوٹ اور نیچے تنگ موری کا پاجامہ اور سر پر ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ یہ ٹوپی پھندنے کے بغیر ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔

یوں تو سرشار بہت زندہ دل تھے لیکن ضد اور دُھن کے پکے بھی تھے۔ انھیں دوستوں کو تنگ کر کے خاص لطف آتا تھا اور موقع ملنے پر لوگوں کو اپریل فول بھی بنا دیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے چند احباب کو اپنے گھر پر دعوت دی اور خود وہاں سے غائب ہو گئے دوستوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نظر دوڑائی۔ مگر دروازے پر ایک فقرے کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ فقرہ یہ تھا۔ "آج اپریل فول ہے۔ آپ اِس کا فائدہ اٹھائیے۔" اِس پر سب کے سب ہنس دیے اور ہوا خوری کرتے ہوئے اپنے گھر لوٹ آئے۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی دلچسپ ہے۔

ایک بار لکھنؤ کی اپنے زمانے کی مشہور سماجی ہستی بابو گنگا پرشاد ورما۔ آپ سے بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب تمھیں اپنے ساتھ بٹھا کر کبھی نہ کھلائیں گے۔ بابو صاحب کے یہاں کی پوریاں آپ کو بہت پسند تھیں۔ آپ کو یہ ضد کہ کھا کر رہیں گے۔ غرض ایک دن آٹھ بجے شام کو آپ پریشاں حال ہراساں صورت بابو صاحب کے گھر پہنچے اور کہا۔ " غضب ہوگیا۔ اِس ناوقت چچا آٹپکے۔ آپ جانیں میرے یہاں مسلمانی کارخانہ ہے۔ وہ دھرم کے پابند ہیں۔ نوکر چلا گیا ہے۔ آپ مہربانی کرکے نوکر ساتھ کر دیجیے۔ ایک گلاس پانی لے چلے میں بازار سے پوری دلوا دوں گا۔ میرے ہاتھ کا چھُوا چچا صاحب نہیں کھاتے۔ اب اِس وقت کہاں جاؤں گا" بابو صاحب چکمے میں آگئے اور کہا۔" ہم نے تمھیں کھلانے کی قسم کھائی ہے۔ چچا صاحب سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ تم گھر چلو۔ چچا صاحب کی خاطر کرو۔ ہم سب سامان بھجوا دیتے ہیں۔ غرض آپ نے اس دن ورما صاحب کے پکوان کی بہت داد دی اور نوکر کے ہاتھ شکریہ کا خط بھیجا۔ جس میں تحریر تھا "چچا صاحب کدھر آئے چلے گئے کچھ پتہ نہ چلا۔ کھانا خراب ہوتا۔ مجبورًا مجھے کھانا پڑا۔" بابو صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت ہنسے اور پنڈت جی سے کہا۔ میں نے توبہ توڑی۔ جب جی چاہے بے تکلف آکر کھا جایا کرو۔"

سرشار گھومنے پھرنے کے بے حد شوقین تھے۔ وہ دن بھر لکھنؤ کی سیر کرتے۔ گھومتے پھرتے اور رات کو لکھا کرتے تھے۔

خاص طور پر رات میں آٹھ بجے کے بعد۔ اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سنیے :

سرشار کی رہائش امین آباد میں ایک سرخ رنگ کی عمارت میں تھی۔ جسے اُس وقت امام بخش کی کوٹھی کہتے تھے۔ وہاں آج کل سبزی منڈی ہے۔ پنڈت بشن نارائن در بھی وہیں رہتے تھے۔ وہ اُن دنوں ۵۵ روپے ماہانہ مشترک کرایہ دیتے تھے۔ سرشار بہت گھمکڑ قسم کے آدمی تھے۔ ایک بار بہت بیمار پڑ گئے۔ گھر والوں نے اُن کا باہر نکلنا بند کر دیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے ایک دن اُن کے مکان پر چند مسلمان عورتیں آئیں۔ جب رخصت ہونے لگیں تو یہ بھی برقعہ پہن کر تیار ہو گئے۔ جب نوکر نے آواز لگائی کہ پردے میں ہو جائیے زنانہ ہے۔ تو یہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اور باہر آ گئے۔ برقعہ پھینک یہ جا۔ وہ جا۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو خوب ہنسے۔ اس کے بعد اُن پر سے پابندی ہٹا لی گئی۔

سرشار بلا کے ذہین تھے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے قلم برداشتہ لکھتے یعنی نہ تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ پچھلی بار کیا لکھا تھا اور نہ ہی انھیں کوئی بتاتا۔ اِس کے علاوہ انھوں نے اپنے مسوّدے پر کبھی نظرِثانی بھی نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ اُن پر آمد کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ کوئلے سے دیوار پر لکھنے لگ جاتے۔ نظرِثانی نہ کرنے کی اُن کی خوبی جہاں اُن کی خود اعتمادی پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہاں ایک پہلو یہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ وہ کتنے لاپرواہ تھے۔ اور اُن میں کس حد

تک بے اعتدالی تھی۔ اگر ان میں یہ کمزوری نہ ہوتی تو وہ اپنے مسودے پر نظرِ ثانی کرتے اور اعتراض کرنے والوں کے منہ پہلے ہی بند ہو جاتے۔

سرشار کے قلم برداشتہ لکھنے کی تصدیق مندرجہ ذیل واقعہ سے بخوبی ہو جاتی ہے:

ایک بار سرشار دوستوں کی محفل میں بیٹھے تھے کہ کسی نے دستک دی۔ سرشار قدرے گھبرا کر کہنے لگے "آگیا۔ آگیا۔ آگیا" پوچھا گیا۔ "اماں کون آگیا؟" "ملک الموت۔ خدارا مجھے بچاؤ" جواب ملا۔ سب حیران پریشان کہ ملک الموت ہے کہاں؟ آخر جب چاروں طرف نظر دوڑائی تو ایک کالا بھجنگ آدمی کھڑا نظر آیا۔ یہ منشی نول کشور کا ملازم تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اُس وقت وہاں نہ کاغذ تھا، نہ قلم اور نہ ہی روشنائی۔ اِدھر اُدھر سے ڈھونڈ کر کاغذ تلاش کیا گیا۔ چق کا سرکنڈہ کاٹ کر قلم تراشا گیا اور اُسی وقت کوئلہ پیس کر روشنائی تیار کی گئی۔ پھر حضرت سرشار نے فسانہ آزاد کی قسط قلم برداشتہ لکھ کر دیتے ہوئے یوں کہا: "جا بھائی جا۔ میرا پیچھا چھوڑ۔"

خوراک

سرشار کھانے پینے کے معاملے میں بہت تیز تھے اور کھاتے بھی خوب تھے۔ پوڑی پکوان پر تو وہ جان دیتے تھے۔ گوشت میں قورمہ انھیں بہت پسند تھا۔ علاوہ ازیں وہ پراٹھے اور ماش

کی دال بھی خوب مزے سے کھایا کرتے تھے۔

سرشار کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ فرقہ واریت اور مذہبی تعصب سے بالاتر رہتے۔ اُن کی نظر میں ہندو مسلمان سب برابر تھے۔ مسلمان خواتین سے انھوں نے زبان سیکھی۔ شائستگی اور تہذیب سیکھی اور اُسے برسوں اپنے ذہن میں سموئے رکھا یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ غالباً اسی لیے وہ مذہبی تعصب سے بالا تر تھے اور اُن کا دل زنگِ کدورت سے پاک تھا۔ منشی سجّاد حسین مرزا چھجو بیگ ستم ظریف سے جہاں اُن کی دوستی تھی وہاں پنڈت بشن نارائن در، پنڈت جوالا پرشاد برقؔ اور پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ بھی ان کے یارِ خاص تھے۔ اُن کا نقطۂ نظر "فسانۂ آزاد" کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

"نفس الامر ہر قدیم مذہب کا عمدہ ہے اور جو توہمات اِس میں داخل ہیں وہ متعصّب اہلِ مذاہب کی کج بحثیوں کے نتائج ہیں۔"

سرشار کی طبیعت میں آزاد پسندی تھی۔ وہ اپنی طبیعت پر کسی قسم کا بوجھ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور اُن میں اکتاہٹ بھی جلدی پیدا ہوجاتی تھی۔ کچہری کے مدرّسی کے ماحول سے اُکتائے تو نول کشور کے یہاں آگئے اور جب وہاں سے جی اُکتا گیا تو "اودھ اخبار" چھوڑ دیا اور فری لانسنگ کرنے لگے۔ وہاں سے جی بھر گیا تو الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم ہوگئے۔ اور جب اُس

ملازمت کو پاؤں کی بیڑی سمجھا تو اُسے بھی چھوڑ دیا۔ یہی نہیں حیدرآباد جاکر جب انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کی شفقت اور دستگیری کی وجہ سے اپنی آزادی پر حرف آتا محسوس کیا تو اُسے بھی ٹھکرا دیا طبیعت میں بے نیازی اتنی تھی کہ کبھی دولت کمانے کی خواہش نہ ہوئی اور نہ ہی کسی امیر یا رئیس کے آگے دامن پھیلایا۔

لاپرواہی اور بے اعتدالی کے ساتھ ساتھ سرشار کو بلا نوشی نے بھی خراب کر دیا تھا۔ شراب نوشی ان کی کمزوری بن چکی تھی۔ اِس کمزوری سے منشی نول کشور نے بہت فائدہ اٹھایا۔ بہرحال آخری عمر میں انھیں ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ کوئی غذا بھی وہ مشکل سے ہضم کر سکتے تھے۔ یہی کمزوری ان کی جان کی دشمن بن گئی۔

اُن کے کردار اور شخصیت کی ایک خوبی یہ تھی کہ جو کچھ دیکھتے اُسے ذہن کی ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔ مثلاً سیر کرتے اور گھومتے وقت اگر بازار میں کوئی مچھلی والی، کوئی بھٹیاری یا کنجڑا اپنے گاہک سے تکرار کرتا نظر آتا۔ دھوبی دھوبن سے لڑتا دکھائی دیتا تو وہ سب کچھ اپنے ذہن میں نقش کر لیتے اور موقع پر وہی زبان اور وہی انداز پیش کر دیتے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے فنکار اور ادیب ہوئے ہیں۔ اُن کا فن تجربات کی روشنی میں نکھرتا، اُبھرتا اور پروان چڑھتا رہا ہے اور آخر ابتدا سے انتہا تک پہنچا ہے۔ لیکن سرشار کی کیفیت ان سے بالکل برعکس رہی ہے۔ جوں جوں اُن کی عمر

عہدِ شباب میں داخل ہوتی گئی اُن کا فن بھی شباب پر آتا گیا اور بڑھاپے کے ساتھ ساتھ اُن کا فن بھی زوال پذیر ہوتا گیا اور آخر عمر کے ساتھ اُسے بھی ضعف آگیا۔ اسی لیے فسانۂ آزاد کے بعد کی اِن کی تخلیقات میں کوئی آب وتاب نہ تھی وہ صرف اِس لیے یاد رکھی جاتی ہیں کہ ادیب کے ذہنی اور فنی عروج اور زوال کا جائزہ لیا جاسکے اور یہ دیکھا جاسکے کہ ایک فن کار کس طرح عروج کی چوٹی پر پہنچ کر زوال کے اندھے کنویں میں جاگرتا ہے۔

سرشار کے خیالات، عقائد اور نظریات

اگرچہ سرشار بذاتِ خود بَلا کے مے نوش تھے۔ لیکن جب انھیں خود اپنی کمزوری کا احساس ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسی لیے انھوں نے اوروں کو شراب نوشی سے دُور رہنے کی تلقین کی۔ انھوں نے مے نوشی کی مذمت میں ہشو کہے اور "جامِ سرشار" کے عنوان سے دو ناول لکھے۔ اِن دونوں ناولوں میں لالہ اور نواب کے کردار ہمارے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لالہ تو جگہ جگہ شراب کی بھٹیاں توڑتے نظر آتے ہیں۔

سرشار صحیح معنوں میں اپنے دور کے ترجمان تھے۔ وہ نہ تو رجعت پسندی کے حامی تھے اور نہ ہی نام نہاد ترقی پسندی کے قائل تھے۔ اُن کی شخصیت مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں اور تمدنوں کا سنگم تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم مغربی اور مشرقی دونوں

تمدنوں کی اچھی باتیں قبول کرلیں اور خراب و ناپسندیدہ باتیں ترک کر دیں۔" فسانۂ آزاد" کا ایک کردار ہے سپہر آرا اس کے مطالعہ سے ہمارے اِس نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیجیے کہ سرشار صحیح معنوں میں ہندوستان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ وہ شمس الضحیٰ میں ہندوستانیوں کی جہالت اور کم عقلی پر اس طرح آنسو بہاتے ہیں:

" الٰہی یہ کیسی ہوا بندھی کہ پیارے ہندوستان کا علم وعمل کا پھولا پھلا چمن اُداس ہوگیا۔ اولعزمی کی ہری بھری شاخیں ایک ہی جھونکے سے پھٹ پڑیں۔ عظمت کے تناور اور بار آور درخت اُڑ اُڑ کر زمین پر آگرے ہیں۔ خزاں کے لشکر نے ایسا حملہ کیا کہ بادِ علم کا محل کھڑے کھڑے اُڑ گیا۔ اہلِ ہنر میں نہ وہ جوش ہے نہ خروش۔"

سرشار نوابوں اور جاگیرداروں کے سخت مخالف تھے کہ جن میں علم وعمل کا فقدان ہے۔ انھوں نے " فسانۂ آزاد" میں ایسے ہی لوگوں کی خبر لی ہے۔

یہی نہیں بلکہ سرشار میلوں ٹھیلوں اور تماشوں میں بچّوں کو گہنے پہنانے کے کٹر مخالف تھے۔ اس لیے " فسانۂ آزاد" کی ہیروئن حسن آرا سے کہلواتے ہیں:

" ہم یہ کبھی نہ مانیں گے کہ گہنا پہنانے سے چھوٹے لڑکے آنکھوں کو اچھا دکھائی دیتے ہیں اور جو اس لیے پہنایا جائے کہ اس کے ماں باپ روپے والے سمجھے جائیں گے۔ یہ بھی کچھ ٹھیک بات

نہیں ہے۔ جو روپیہ ہی دکھانا ہے تو یہ کیوں نہ کرے کہ اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ دیکھو انگریز لوگ کبھی ایسا نہیں کرتے۔ کوئی تو کہہ دے کہ ہم نے انگریزوں کے لڑکوں کو کڑا یا ہنسلی یا کوئی اور گہنا پہنے کبھی دیکھا ہو۔"

سرشار عورتوں کی تعلیم کے دل و جان سے حامی تھے۔ "فسانۂ آزاد" میں یہ کہتے ہیں :

"واقعی ہندوستان میں تعلیم نسواں کی بدرجۂ غائب ضرورت ہے۔ تعلیم نسواں سے صرف عورتوں کو فائدہ نہ ہوگا بلکہ مرد بھی فوائدِ عظیم حاصل کریں گے۔ ایک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ اگر عورتیں تربیت یافتہ ہوں گی تو مردوں کو مارے شرم کے ضرور پڑھنا ہوگا۔"

سرشار کے اِس نظریے کی تائید بھی اس بات سے ہو جاتی ہے کہ انھوں نے فسانۂ آزاد میں سپہرا اور کلیریسا سے عورتوں کی تعلیم کا ایک کالج جاری کرایا۔

سرشار بچّوں کو انگریزی اسکولوں میں بھیجنے کے حامی تھے اور ساتھ ہی پرانی قدروں کو بھی ہاتھ سے دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اسی فسانۂ آزاد میں فرماتے ہیں :

"اپنے لڑکوں کو اپنے اعزا واقربا میں انھیں لوگوں کے سپرد کریں جو انگریزی مدرسوں اور مکتبوں دونوں کی طرزِ تعلیم سے واقف ہوں اور خود بھی کبھی ماسٹر رہ چکے ہوں۔" سرشار موجودہ طرزِ تعلیم سے بے حد نالاں تھے۔ اسی لیے اُن کا ہیرو میاں آزاد ایک خطبہ میں یوں کہتا ہے :

"ہم کو لازم ہے کہ صرف ایم۔اے۔بی۔اے یا بی۔ایل کی ڈگریوں کے عاشق و دلدادہ نہ ہوں۔ یہ صرف برائے نام خالی خولی عزت ہے۔ مقدم یہ ہے کہ علوم والسنہ میں قابلیت حاصل کریں۔"

سرشار نوجوانوں کو کلرک بنانے کے بجائے انھیں تجارت کی جانب راغب کرنے کے حامی تھے۔ فسانۂ آزاد میں میاں آزاد ایک ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں :

"منصفی یا ڈپٹی کلکٹری کا پانا تو بجز کوئی تیس روپے ماہوار کا نوکل فنڈ کلرک ہوگیا۔ کسی نے پندرہ بیس کی اسامی پائی۔ اب فرمائیے ان عہدوں پر امیرزادوں کا رہنا تضیع اوقات ہے یا نہیں۔ اگر اس کے برعکس وہ تجارت کی طرف متوجہ ہوں تو سبحان اللہ تجارت سے ملک کی ثروت و ترقی رونق پاتی ہے اور ثروت سے آسودگی، فارغ البالی، آرام و عیش کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی ہے۔"

سرشار سمندر پار جانے کے قائل تو تھے لیکن محض سیر سپاٹے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کو علم حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اِس لیے "سیرِ کہسار" میں لکھتے ہیں :

"پُرانے فیشن کے ہندو ولایت جانے کے کئی نقص بتاتے ہیں۔ ایک یہ کہ دھرم جاتا رہتا ہے۔ اس اعتراض کی وقعت ظاہر ہے۔ اوّل تو ہماری سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ دھرم جانے کے کیا معنی؟ دھرم کسی عارضے کا نام تو ہے نہیں کہ سمندر کی ہوا سے پیدا ہو جائے یا جاتا رہے یا جہاز پر بیٹھنے سے انسان کے جسم میں بے دھرمی

پیدا ہوجائے۔ دھرم تو عقیدے کا نام ہے۔ عقیدہ کو جہاز یا ولایت سے کیا سروکار مگر بعض جہلا نے یہ بیخ لگا دی کہ سمندر میں گئے اور سیدھے نرک میں پہنچے۔

یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ولایت جاکر ہندو لوگ انگریزوں اور عیسائیوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتے ہیں اور نلوں کا پانی پیتے ہیں اب فرمائیے نلوں کا پانی کہاں نہیں پیتے۔ کلکتہ میں بڑے بڑے باجپائی اور بڑے بڑے برہمن نلوں کا پانی پیتے ہیں یا نہیں۔ راجپوتانہ میں اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہندو پانی کی چھوت نہیں سمجھتے۔ دلی میں بعض برہمنوں کے یہاں اب تک سقے پانی بھرتے تھے اور اب اگر کوئی سقے کا پانی پیئے تو کوئی اعتراض نہیں کرسکتا باقی رہا یہ امر کہ عیسائیوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا وہ لوگ جو ولایت نہیں جاتے اس سے بری ہیں۔ کیا بنگال کے ہندو کھلے بندوں ہوٹلوں میں کھانا نہیں کھاتے۔ کیا جب وہ لوگ مرتے ہیں تو برہمن اور پنڈت اُن کا کریا کرم نہیں کرتے۔"

ان عقائد پر ہی بس نہیں۔ سرشار نے ۱۸۹۴ء میں اپنے دوست بشن نارائن کے لندن سے لوٹنے پر لکھنؤ میں منعقدہ ایک استقبالیے میں شرکت کی تھی اور اُس موقع پر اپنی مثنوی "تحفۂ سرشار" پڑھی تھی۔ اس نظم کے مطالعے سے بھی یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ سرشار کٹر پنتھی طبقے کے کتنے مخالف تھے اور سمندر پار جانے والے نوجوانوں کی محنت اور لگن کی کس طرح داد دیتے تھے۔

سرشار ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندوستانی تہذیب کے دو اہم جزو تصوّر کرتے تھے۔ "سیرِ کہسار" میں رقم طراز ہیں :

"جب تک ہندو مسلمان دونوں ترقی نہ کریں۔ یہ ممکن نہیں کہ فائدہ ہندوستان کو حاصل ہو۔ وہ ہندو جو اہلِ اسلام کی ترقی پر حسد کرتے ہیں اپنے ملک کے دشمن ہیں۔ اسی طرح جو اہلِ اسلام ہندوؤں کے ولایت جانے کے خلاف ہیں وہ بھی برسرِ غلطی ہیں"۔

سرشار کی روشن خیالی اس بات سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ سماجی ترقی کو دھرم پر ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اسی سیرِ کہسار میں کہتے ہیں :

"اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ہندو دھرم دھرم پکاریں اور زمانۂ حال کی ترقیوں سے منزلوں دُور رہیں۔ اگر دھرم کی بھونڈی باتوں کی پیروی کی گئی تو ہندو سوشل گھوڑ دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جائیں گے"۔

اِن تمام عناصر سے سرشار کی زندگی، کردار، شخصیت اور نظریات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

دوسرا باب

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصانیف

کہا جاتا ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنی زندگی میں دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ لیکن اِس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ بازار میں ان کے ناولوں میں "فسانۂ آزاد"، "سیرِ کہسار" "جامِ سرشار"، "کامنی" اور "ہشو" کے علاوہ اور کوئی ناول نہیں ملتا۔ اُن کی تقریباً ایک درجن تصانیف ہماری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں۔ جن کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سرشار کی تصانیف کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔ تراجم

۲۔ ناول

۳۔ ناولٹ

سب سے پہلے ہم سرشار کے تراجم کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ اِن میں "شمس الضحیٰ"، "اعمال نامہ روسو"، "خدائی فوجدار" اور "الف لیلیٰ" قابلِ ذکر ہیں۔ اِن میں سے پہلی تین کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہیں اور آخری کتاب الف لیلیٰ فارسی کا ترجمہ ہے۔

اِس ناول کے بعد اُن کے جن ناولوں کا جائزہ لیا جائے گا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

"فسانۂ آزاد"، "سیرِ کوہسار"، جامِ سرشار" اور "کامنی"

آخر میں ہم اُن کے چند ناولٹ اور افسانوں کو اپنی بحث کا موضوع بنائیں گے اُن میں سے خاص طور پر "پی کہاں"، "ہشو" "کڑم دھم"، "طوفانِ بے تمیزی" اور "رنگے سیار" قابلِ ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں سرشار نے کچھ شعری تخلیقات بھی پیش کی تھیں۔ جن میں چند غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی "تحفۂ سرشار" اور قصیدہ "طوفانِ سرشار" بھی ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔

تراجم

شمسُ الضحیٰ

فزکس اور جغرافیہ کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں زمین، آسمان، چاند اور ستاروں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انھیں چار کُرّوں کا نام دیا گیا ہے۔ پہلے کُرّے میں زمین کی گردش شکل وصورت کا ذکر ہے۔ اِس حصّے کے ۲۱ اقمار ہیں۔ یعنی یوں سمجھ لیجیے کہ ۲۱ باب ہیں۔ ان میں زمین کی مکمل کیفیت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ دوسرا کُرّہ نظامِ شمسی سے متعلق ہے۔ اِس کے ۱۹ اقمار یعنی باب ہیں۔ اس میں چاند، سورج، ستاروں

اور دیگر اجرامِ فلکی کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

تیسرے کرّے میں زمین کی مکمل کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اِس کے چار اقمار یعنی باب ہیں۔

چوتھے کرّہ میں انسان اور اُس کی مختلف کیفیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا صرف ایک قمر یعنی باب ہے۔

اس کتاب کی کئی خوبیاں ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ جغرافیہ اور فزکس کے علم کا باقاعدہ اُردو ترجمہ پہلی بار پیش کیا گیا۔

دوسری خوبی یہ کہ سرشار نے اُس کا نہایت خوبصورت ترجمہ کیا ہے اور اس ترجمے پر حقیقی تصنیف کا احساس ہوتا ہے۔

تیسری خوبی اِس ترجمہ کی یہ ہے کہ اس کے اندازِ بیان پر سرورؔ کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ یعنی سارا بیان مسجّع و مقفّیٰ عبارت میں ہے۔

چوتھی خوبی یہ ہے کہ سرشار نے فزکس اور جغرافیہ جیسے خشک موضوع کو دلچسپ بنانے کے لیے جگہ جگہ مزاحیہ انداز اپنایا ہے اور اشعار بھی شامل کیے ہیں۔

الف لیلیٰ

الف لیلیٰ کے قصّوں کا ترجمہ سرشار نے فارسی سے اُردو میں کیا ہے اور یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں نول کشور سے شائع ہوئی۔ اس کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ اس کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ "شمس الضحیٰ" یا "فسانۂ آزاد" والے سرشار نہیں بلکہ کوئی

اور سرشار ہیں۔ اندازِ بیان نہایت کمزور اور پھسپھسا ہے اور اس ترجمہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کا وہی سرور کا انداز ہے۔ ایسا انداز ایک دو تصانیف میں تو چل سکتا ہے، سب میں نہیں۔ ساری عبارت مسجّع اور مقفّیٰ ہے۔ اگرچہ سرشار نے اس میں جگہ جگہ اشعار بھی چسپاں کر دیے ہیں۔ لیکن ترجمہ کی عزابت برقرار رہتی ہے۔

خدائی فوجدار

یہ اسپینی زبان کے ایک مشہور ناول نگار سروانٹس کے شہرۂ آفاق ناول "ڈان کوئکزاٹ" کا انگریزی سے اُردو ترجمہ ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے۔ اِس ناول کا ہیرو ڈان کوئکزاٹ ہے وہ اپنی احمقانہ حرکتوں سے لوگوں کو ہنساتا رہتا ہے۔ وہ بہادری کے نشے میں چور ہو کر اوروں کے معاملات میں ہمیشہ ٹانگ اڑاتا رہتا ہے اور ہر کسی کی امداد کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ ایک بار اُس پر یہ سنک سوار ہو جاتی ہے کہ اُسے مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑانا چاہیے۔ لہٰذا وہ اُس دُھن میں اپنے نوکر کو ساتھ لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ مگر کسی کی مدد کرنا تو دُور رہا وہ اپنی اول جلول حرکتوں سے وہ سب کی دلبستگی کا سامان بن جاتا ہے۔ آخر میں وہ گلابو جان کے عشق میں مبتلا بھی ہو جاتا ہے۔ اُسے ایک جزیرے کا گورنر بنا دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ سات روز تک حکومت بھی کرتا ہے اور جنگ بھی۔ لوگ اُسے خوب اُلّو بناتے ہیں۔ آخر

گورنری چھوڑ کر بھاگ آتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ گلابو جان کے فراق میں کئی سال تک صحرا کی خاک چھانتا ہے اور اپنے گھر لوٹ آتا ہے اور یہیں اس کی موت ہوجاتی ہے۔

اس ناول کے ہیرو کو مطالعہ کا بھی شوق چُراتا ہے۔ وہ ہر اوٹ پٹانگ کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح اپنی حماقت کا ثبوت دیتا ہے۔

خدائی فوجدار ناول کیا ہے۔ مزاح اور ظرافت کا اچھا خاصہ پٹارہ ہے۔ سرشار نے بھی اس کتاب کے دیباچے میں یوں لکھا ہے:

" دو گھنٹے ترجمہ میں صرف ہوتے تھے تو دس منٹ ہنسنے میں، پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔"

اس ناول کا ترجمہ نہایت پاک اور صاف ہے۔ کہیں بھی تصنّع اور بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ جگہ جگہ اشعار شامل کرکے اس کی تازگی اور شگفتگی میں اضافہ کردیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصّوں میں کیا گیا ہے۔ قصّہ کوتاہ فنِ ترجمہ کے اعتبار سے " خدائی فوجدار" کو سرشار کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

اعمال نامۂ روس

یہ کتاب نامور انگریزی سیاح میکنزی والیس کے روس کے سفر نامے کا انگریزی سے اُردو ترجمہ ہے۔ رائل سائز کے سوا چھ سو صفحات سے زائد پر مشتمل ہے۔ اس میں روس کی سماجی، تہذیبی، سیاسی اور تجارتی زندگی کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔

میکنزی والیس چھ برس روس میں رہا اور اُس نے وہاں کی زندگی کا قریبی مطالعہ کیا۔ وہ ۱۸۷۶ء میں واپس انگلینڈ آتے ہی یہ سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا۔ جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہو گیا۔ اس کے بعد منشی نول کشور نے اُس کے اُردو ایڈیشن کی اشاعت کے حقوق حاصل کر لیے۔ جب اس کتاب کا ترجمہ شروع کیے جانے کی بات چلی تو میکنزی والیس اُس وقت زندہ تھے۔ منشی نول کشور نے انھیں ایک خط میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے بارے میں یوں لکھا :

"پنڈت رتن ناتھ سرشار ایڈیٹر اودھ اخبار صوبے بھر میں اس کام کو انجام دینے کے لیے بہتر اور موزوں شخص ہیں۔"

"اعمال نامۂ روس" میں سرشار نے فنِ ترجمہ کا حق بخوبی ادا ادا کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے کہیں بھی لفظی ترجمہ نہیں کیا۔ اُسے پُر لطف اور دلچسپ بنانے اور سفرنامے کی خشکی دور کرنے کے لیے کہیں کہیں اشعار ضرور شامل کر دیے ہیں۔ اور مزاح کی چاشنی بھی چڑھادی ہے۔

یہ تو تھے سرشار کے چند ترجمے آئیے اب ہم سرشار کے چند ناولوں پر نظر ڈال لیں :

فسانۂ آزاد

یہ سرشار کا شاہکار ناول ہے اور ضخیم ترین بھی۔ اُردو ادب میں اس ناول کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

فسانۂ آزاد سرشار کی شاہکار تصنیف ہی نہیں پورے اُردو ادب کا ایک اہم ناول ہے۔ اس کی ابتدا بھی بڑے دلچسپ انداز سے ہوئی تھی۔ سرشار نے ۱۸۷۸ء میں جب "اودھ اخبار" میں بحیثیت ایڈیٹر شرکت اختیار کی تھی تو پہلے وہ اس میں علمی مضامین شائع کرتے رہے۔ اس کے بعد سروانٹس کا شہرۂ آفاق ناول "ڈان کوئکزاٹ" کا اُردو ترجمہ قسط وار شائع ہونے لگا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہوگیا۔

پنڈت برج نرائن چکبست نے فسانۂ آزاد کی ابتدا کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

"جب حضرت سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز یاران دقیقہ رس و صحیح نفس کی صحبت میں گزرتے تھے۔ اس صحبت میں جہاں ایک سے ایک حاضر جواب اور طرّار موجود رہتا تھا۔ وہاں منشی سجّاد حسین ایڈیٹر اَودھ پنچ اور پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ مرحوم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ اسی صحبت میں پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھیے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیے تو وہ ڈان کوئکزاٹ ہے۔ اگر اردو میں اس طرز کا ناول لکھا جائے تو خوب ہے۔ سرشار کے دل پر اُس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اُردو میں ڈان کوئکزاٹ کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ "اودھ اخبار" میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرّم پر مضمون نکل گیا،

کبھی چہلم پر اور کبھی عیش باغ کے میلے پر۔ اُس وقت تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اور حضرت سرشار کا بھی شاید یہی منشا ہو۔ مگر لوگوں کو یہ سلسلہ ایسا بھایا کہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مختلف مضامین گوندھ کر فسانے کا سلسلہ نکالا گیا ۔"

اس طرح دسمبر ۱۸۷۸ء سے اودھ اخبار میں یہ ناول" فسانۂ آزاد" کے عنوان سے قسط وار شائع ہونے لگا۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۸۷۹ء تک پورے ایک سال جاری رہا اور اس کے بعد اگلے سال یعنی دسمبر ۱۸۸۰ء میں یہ ناول چار جلدوں میں پوری تقطیع کے تقریباً سوا تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

فسانۂ آزاد کا قصہ مختصر طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے :

رتن ناتھ سرشار کے اس ناول کے ہیرو میاں آزاد ہیں جو نہایت آوارہ اور اوباش قسم کے انسان ہیں۔ ان کے ایک اور ساتھی ہیں میاں خوجی۔ یہ دونوں حضرات لکھنؤ میں رہتے ہیں اور وہیں جوتیاں چٹخاتے اور آوارہ گردی کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے بازاروں کی سیر کرتے ہیں۔ وہاں کے میلے ٹھیلے دیکھتے ہیں کھیل تماشوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نوابوں کی صحبت اٹھاتے ہیں اور ان کے دربار میں جاکر مصاحبی بھی کرتے ہیں۔ اسی دوڑ دھوپ میں میاں آزاد لکھنؤ کے ایک اعلا خاندان کی حسین دوشیزہ حسن آرا کے دام عشق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حسن آرا میاں آزاد کا امتحان لینے کے لیے ترکی میں روسیوں کے خلاف جنگ

میں شرکت کی تحریک دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تمھیں سچّا عاشق تبھی سمجھوں گی اگر تم ترکی جاکر روس کے خلاف لڑی جارہی جنگ میں حصّہ لو اور اپنے مسلمان بھائیوں کی ہر ممکن امداد کرو۔ اگر تم کامیاب اور کامراں ہوکر لوٹے تو میں تم سے شادی کرلوں گی۔ اگر وہیں جنگ میں کام آئے تو شہادت پاؤ گے۔

یہ بات میاں آزاد کے دل پر اثر کر گئی اور انھوں نے فوراً ترکی جانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ آخر وہ اپنے رفیق میاں خوجی کے ساتھ ترکی جا پہنچے۔ وہاں روسیوں کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا اور فتح یاب ہوکر لکھنؤ لوٹے۔ لہذا حسن آرا نے اپنے وعدے کے مطابق میاں آزاد سے شادی کرلی اور یہ دونوں میاں بیوی قومی اور سماجی اصلاح کے کارِ نیک میں مصروف ہوگئے۔ اس مختصر اور معمولی سے قصّہ کو شیطان کی آنت کی طرح پوری تقطیع کے جہازی سائز کے سوا تین ہزار سے زائد صفحات میں پھیلا دینا سرشار ہی کا کام تھا۔

فسانۂ آزاد کا پلاٹ

عہدِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں فسانۂ آزاد کے پلاٹ کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ ایک فرسودہ، بے جان اور بوسیدہ قصّہ نظر آئے گا۔ لیکن اگر ہم اسے اُسی ماحول میں پرکھیں جس میں سرشار کی ادبی تخلیقات نے جنم لیا تو ہمیں یہ ہر اعتبار سے ایک جدّت پذیر کہانی نظر آئے گی۔ کیونکہ اُس وقت سارا ماحول ایک ہی سانچے

میں ڈھلا ہوا تھا۔ غدر ابھی ابھی فرو ہوا تھا۔ انگریزوں کے پاؤں آہستہ آہستہ مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔ نوّابی عہد کے دن مر چکے تھے۔ اصلاحات کا زمانہ تھا۔ نئی نئی سائنسی ایجادات رونما ہو رہی تھیں۔ انگریزی تعلیم کا چلن ہو چکا تھا۔ نئی سماجی اصلاحی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ خوشحالی کے باعث لکھنؤ میں پہلی سی رنگینی آگئی تھی۔ عیش و نشاط کی محفلیں گرم ہونے لگی تھیں۔ فارغ البالی کے نتیجے میں ہندوستان کے اس عظیم تہذیبی اور تمدنی مرکز میں آزاد جیسے آوارہ اور مست مولا قسم کے انسان عموماً مل جاتے تھے۔ اُس زمانے میں آنکھوں سے پیچ لڑانا بڑی آسان بات سمجھی جاتی تھی۔ فنّی اعتبار سے فسانۂ آزاد کی کہانی بہت سست ہے۔ پوری تقطیع کے سوا تین ہزار صفحات جس کہانی کا تانا بانا بُننے میں صرف کیے گئے ہیں وہی کہانی فل اسکیپ کے زیادہ سے زیادہ دو صفحات میں کہی جا سکتی ہے۔

شروع میں سرشار کا مقصد لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کے پہلو نمایاں کرنا تھا۔ اس افسانے کا کوئی باقاعدہ پلاٹ تو تیار کیا نہیں گیا تھا۔ اور نہ ہی سرشار کے ذہن میں اس کا پہلے سے کوئی خاکہ موجود تھا۔ نہ اودھ اخبار کی قسطیں تحریر کرتے وقت کوئی انھیں بتاتا تھا کہ پچھلی مرتبہ افسانے کی کڑی کہاں ٹوٹی تھی۔ وہ تو قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مسوّدے پر نظرِ ثانی بھی نہیں کرتے تھے اور سرشار کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ کہ اُن کا یہ سلسلۂ مضامین اتنا مقبول ہوگا۔ آخر دس بارہ قسطیں چھپنے کے بعد اودھ اخبار کے

قارئین سے رائے طلب کی گئی اور اکثریت نے یہ سلسلہ برقرار رکھنے کے حق میں رائے دی۔ چنانچہ تبھی اسے جاری رکھا گیا۔

دوسری خوبی فسانۂ آزاد کی یہ ہے کہ اُس کے مطالعہ سے آج سے سو برس قبل کے ہندوستان اور خصوصاً اُردو داں طبقے کی سماجی۔ تہذیبی اور تمدنی زندگی جھلک ہمیں مل جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی علم ہوجاتا ہے کہ لوگ اُس زمانے میں فارغ البال اور خوشحال تھے۔ اس لیے مطالعہ کی فرصت تھی اور بطور خاص طویل قصّے اور ناول اس زمانے میں زیادہ پسند کیے جاتے تھے۔ جب کہ آج کل صورتِ حال بالکل برعکس ہے۔

ایک کمزوری فسانۂ آزاد کی یہ ہے کہ اس میں ایک کردار یا واقعہ کے سہارے پلاٹ آگے نہیں بڑھتا اور نہ ہی کرداراور واقعات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اس میں واقعات اور کرداروں میں کوئی تال میل نہیں۔ ایک کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑتی نظر نہیں آتی اور خصوصاً اس طویل افسانے کی پہلی جلد تک اِس افسانے کا کوئی سرپیر ہی نظر نہیں آتا اور نہ ہی اس کے اہم کردار سامنے آتے ہیں۔ البتہ اس کا سرا دوسری جلد میں جاکر ملتا ہے۔ اس لیے بحیثیت ناول اس کی بے ربطی ذہن پر بار گزرتی ہے اور اس کا پلاٹ ہلکا پھلکا اور معمولی نظر آتا ہے۔

اِس کے علاوہ سرشار نے فسانۂ آزاد میں چند ایسے ضمنی واقعات شامل کردیے ہیں جن کا اصل قصّے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے پیوندکاری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے یہ پہلو بھی اس ناول

کو کافی حد تک کمزور کر دیتا ہے۔

فسانۂ آزاد کی منظر نگاری

سرشار نے فسانۂ آزاد میں منظر نگاری کا کمال دکھلایا ہے۔ بقول پنڈت بشن نارائن دَر اُن کی منظر نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فسانۂ آزاد میں چیزوں کی نہیں بلکہ انسانوں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ وہ رجب علی بیگ سرور کی طرح بے روح گونگے، بہرے اور خوابیدہ کردار اور مناظر پیش نہیں کرتے۔ صرف چیزیں نہیں دکھاتے بلکہ ہنستے، بولتے، ناچتے، گاتے اور بھاگتے دوڑتے ماحول کی عکّاسی کرتے ہیں۔

سرشار کی منظر نگاری کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اودھ اور خاص طور پر لکھنؤ کی تمدنی زندگی اور کلچر کی جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ لکھنؤ کا محرّم ہو یا چہلم، بسنت کا میلہ ہو یا چوک بازار، تیراکی کا مقابلہ ہو یا بیٹر بازی، بیت بازی ہو یا پتنگ بازی، معاشرے کا کوئی پہلو ان کی عقابی نگاہوں سے بچ کر نہیں جا سکا۔

سرشار کی منظر نگاری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ فسانۂ آزاد پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے کسی دوست کو لکھنؤ کی سیر کرا رہے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کے نوابی محلوں کی عکّاسی اس خوبصورتی سے کی ہے اور اُن کی زندگی کو ایسی چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ اُس زمانے کی پوری سماجی تہذیبی اور تمدنی زندگی کے مناظر آنکھوں کے آگے گھوم جاتے ہیں۔ جب وہ اللہ رکھی بھٹیاری کی سرائے کا

منظر پیش کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے بی بھٹیاری سے گفتگو ہو رہی ہے۔ چوک بازار کی عکاسی کرتے ہیں تو کہیں قلفی والے سے روشناس کراتے ہیں تو کہیں کبابی نظر آتے ہیں اور کہیں سقوں کی آوازیں اور کٹورے بجنے کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ اُن کی منظر نگاری کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس دوران اُن کا مخصوص کردار راوی کہیں نظر نہیں آتا۔ یعنی وہ اپنی زبان سے ماحول کی خوبی یا خرابی بیان نہیں کرتے صرف تصویریں پیش کرتے جاتے ہیں۔ آپ پڑھتے رہیں، لکھنؤ کی سیر کرتے رہیں اور لطف اٹھاتے رہیں۔

اس کے باوجود سرشار کی منظر نگاری کا ایک کمزور پہلو بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ فسانۂ آزاد میں انھوں نے جہاں بھی لکھنؤ کی منظر نگاری کی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن جب بھی انھوں نے لکھنؤ سے باہر قدم رکھا۔ بمبئی گئے یا ترکی۔ وہیں منہ کی کھائی۔ بیرونی مقامات کی عکاسی کرتے وقت بھی انھیں لکھنؤ ہی کی یاد آتی ہے اس سے لکھنؤ، بمبئی اور ترکی کی تہذیبی زندگی میں زمین آسمان کا فرق نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سرشار نے لکھنؤ کی عکاسی کرتے وقت مشاہدہ سے کام لیا اور لکھنؤ سے باہر ماحول کی منظر نگاری کے لیے انھوں نے مطالعہ اور تمثیل کا سہارا لیا۔ اس لیے غیر لکھنوی ماحول کی منظر نگاری میں بے پناہ تصنع اور بناوٹ کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔

فسانۂ آزاد کے کردار

سرشار کے فسانۂ آزاد کے خاص خاص کردار مندرجہ ذیل ہیں:

میاں آزاد

فسانۂ آزاد کا خصوصی کردار میاں آزاد ہے۔ کہنے کو یہی اس ناول کا ہیرو ہے اور پوری کہانی اسی کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ آزاد ایک یارباش، چرب زبان اور جہاں گرد انسان ہے۔ جہاں جاتا ہے وہیں اپنی لچھے دار زبان سے لوگوں پر جادو کر دیتا ہے۔ وہ ایک اعلا کشمیری گھرانے سے تعلق ضرور رکھتا ہے۔ لیکن پوری تقطیع کے سوا تین ہزار صفحات میں کہیں بھی سرشار نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ آزاد کس گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اسے تعلیم یافتہ ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ تعلیم کہاں پائی۔ میاں آزاد کا حلیہ یوں بیان کیا گیا ہے۔" بھرے بھرے گال، لمبا قد۔ توانا جسم۔ سیب کی طرح سرخ دمکتا چہرہ۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ پاؤں میں نکے دار لکھنوی جوتی۔ شیروانی یا کبھی کبھی لکھنوی انگرکھا پہن لینا اُس کے مزاج میں داخل ہے۔ ہاتھ میں چھڑی۔" دراصل اس کردار کے بھیس میں خود سرشار بھاگتے، دوڑتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

میاں آزاد شروع ہی سے آزاد خیال ہے۔ وہ گنڈے تعویذ کا قائل نہیں۔ توہمات کو اس کی زندگی میں کوئی دخل نہیں۔

وہ قدم قدم پر رجعت پسندوں کا مذاق اڑاتا ہے۔آزاد علم وعمل کا قائل ہے۔ اس کا روس کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے ترکی جانا ہی اس کا ثبوت ہے۔ ترکی سے لوٹ کر لکھنؤ میں سماجی اصلاحات کے لیے کام کرنا اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ وہ تعلیم نسواں کا دل سے خواہاں ہے۔ وہ خواتین میں بیداری لانا چاہتا ہے اور وہ نوجوانوں کو سمندر پار جانے کی تلقین بھی کرتا ہے۔صرف لیکچروں کے ذریعہ۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود سرشار کے اس کردار میں ایک بہت بڑا جھول ہے۔ آوارگی اور صرف آوارگی اس کا شیوہ ہے۔ آزاد دراصل اپنے دور کی علامت ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے ہے۔وہ چار پانچ زبانوں سے واقف ہے۔ مگر اس کے لیے سرشار نے کوئی میدان ہموار نہیں کیا۔

دوسری کمزوری اس کردار کی یہ ہے کہ وہ ترکی سے لوٹ کر فقط مقرّر ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ علم وعمل کی قوت واپس آکر ختم ہو جاتی ہے اور آوارگی کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں آزاد ایک وفادار دوست بھی کہیں ظاہر نہیں ہوتا۔ آزاد کا رفیق ہمنوا، غم خوار اور دوست خوجی ہر آڑے وقت میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اللہ رکھی بی بھٹیاری اس کے نام کی مالا جپتے جپتے جوگن بن جاتی ہے۔ لیکن آزاد دونوں کو انگوٹھا دکھا دیتا ہے۔خوجی کے تئیں اُس کی بے رخی واقعی افسوسناک ہے۔

ہمایوں فر

رتن ناتھ سرشار کے اہم کرداروں میں ہمایوں فر کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اُسے ہم لکھنؤ کے بگڑے نوابوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ جوئے بازی کے دو چار کرتب دکھا کر شہر کی خوبصورت بہو بیٹیوں پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خود بھی ایک خوبصورت نوجوان ہے۔ جس پر فسانۂ آزاد کی ہیروئن حسن آرا کی چھوٹی بہن سپہر آرا بری طرح لٹو ہے اور یہ بھی اُس کے عشق میں مبتلا ہے۔ یہ جواں مردی کے جوہر بھی دکھاتا ہے اور ایک جلتے ہوئے مکان میں گھس کر ایک بچّے کو شعلوں سے نکال لاتا ہے۔ تبھی سے سپہر آرا اس پر جان چھڑکنے لگتی ہے۔

ہمایوں فر کا کردار آزاد کے مقابلے میں اس لیے بہتر ہے کہ وہ اندر اور باہر یعنی ذہنی اور جسمانی طور پر ایک ہے۔ مگر سرشار یہاں بھی کرامت دکھانے سے نہیں چوکتے۔ ہمایوں فر قتل بھی ہو جاتا ہے۔ دم بھی توڑ دیتا ہے۔ اُسے سپردِ خاک بھی کر دیا جاتا ہے لیکن سرشار اُسے یہ کہہ کر زندہ کر دیتے ہیں کہ اس کے ہم شکل کسی دوسرے شخص کا قتل ہو گیا تھا۔ اُسے عوام کی پسند کہیے یا معجزہ۔ اس کا نام ہی ہمایوں فر ہے

خوجی

خوجی فسانۂ آزاد کا حقیقی معنوں میں ہیرو ہے۔ اس طویل اور

ضخیم ناول میں قارئین کی دلچسپی اور ہمدردی اگر کسی کے ساتھ آخر تک برقرار رہتی ہے تو وہ خوجی ہے۔خوجی سرشار ہی کا نہیں بلکہ پورے اُردو ادب کا شاہکار کردار ہے۔یہ حقیقت ہے کہ اگر فسانۂ آزاد میں خوجی نہ ہوتا تو اس طویل ناول کو پڑھنے کی کوئی ہمت نہ کرتا۔خوجی میاں آزاد کا دوست، رفیق، ہمنوا، غم خوار اور بہی خواہ بھی۔اس عجیب غریب کردار کی ایک ایک حرکت دلوں کو گدگدا دیتی ہے۔خواجہ بدیع الزماں کی فرضی قرولی باہر نکلی نہیں کہ قارئین کا باچھیں کھل نہیں۔دراصل یہ انسان نہیں مجسم شامت ہے۔پستہ قد، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی اور شرارت و خباثت کی نشانی، بکرے کی طرح لٹکتی ہوئی داڑھی، چہرہ صفاچٹ اور سر پر ترکی ٹوپی، دُبلا پتلا جسم اور عمر ایک زیادہ نہ کم پورے ساٹھ سال اور جب آزاد اُس کی کسی حرکت سے تنگ آکر زناٹے دار چپت جمادیتا ہے تو چپت کھاتے ہی وہ گالیاں دینے لگتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ نہ ہوئی میری ولایتی اس وقت میرے پاس ورنہ بھُنا سا سر اُڑا دیتا۔اور جو کہیں جوان ہوتا تو اسی وقت دفن کر دیتا اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچا ہی کھاجاتا اور کہیں نشے کی جھانجھ ہوتی تو گھول کر پی جاتا اور جب خوجی کی چنیا بیگم یعنی افیم گھولنے والی چینی کی پیالی ساتھ ہو تو کیا کہنے۔اور افیم کی پینک میں جھومتے ہوئے گنڈیریاں چوستے وقت اس کی شان ہی نرالی ہوتی ہے اور ہر موقع پر پیٹنا خوجی کی شان ہے۔

خوجی ایک عمدہ مصاحب بھی ہے، خوشامدی اور چاپلوس

بھی۔اس کے علاوہ وہ ایک وفادار دوست بھی ہے۔ اسے اپنے متعلق یہ غلط فہمی بھی ہے کہ ہر جوان عورت اس سے عشق کرتی ہے اور جب کوئی عورت اس کی شکل وصورت اور احمقانہ حرکتوں پر مسکرانے لگے تو حضرت یہی سمجھتے ہیں کہ وہ مجھ پر مرمٹی ہے۔ اس عشق کا بھوت سر سے اتارنے کے لیے اس کی خوب پٹائی بھی ہوتی ہے۔ خاص طور پر سرائے کی بھٹیارن .بوا زعفران کے ہاتھوں۔خوجی ایک زوال آمادہ جاگیر دارانہ نظام، تمدن اور تہذیب کا ایک خاص کردار ہے۔ وہ ہماری مٹتی ہوئی معاشرت پر ایک بھرپور طنز ہے دراصل اس کردار کے ذریعہ سرشار نے اپنے دل کی بات کھل کر کہہ دی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سرشار نے اپنی ساری محنت خوجی کے کردار دلچسپ بنانے، نکھارنے اور سنوارنے پر صرف کر دی ہے۔خوجی کے کردار کے باعث ہی فسانۂ آزاد شکاگو کی نمائش میں بھیجا گیا اور لندن سے تعریفی خطوط بھی ملے تھے۔

اسی کی بدولت سرشار کو اُردو ادب کا چارلس ڈکنس اور والیٹر کہا جانے لگا۔

سپہر آرا

سپہر آرا فسانۂ آزاد کی ہیروئن حسن آرا کی چھوٹی بہن ہے۔ یہ حسین، دلفریب۔ تعلیم یافتہ اور ذہین خاتون ہے۔لیکن آزاد کی طرح اس کے بارے میں بھی پتہ نہیں چلتا کہ اُس نے تعلیم کہاں

حاصل کی۔ اُسے ہمایوں فر سے بے پناہ عشق ہے اور وہ اس پر جان چھڑکتی ہے۔ اپنے بہادر عاشق کی صحیح معنوں میں قدر کرتی ہے۔ لیکن اُسے نہ تو کوئی تحریک دیتی ہے اور نہ ہی کوئی وعدہ وغیرہ کرتی ہے۔ بلکہ اس کی بہادری سے متاثر ہو کر اُس سے شادی کر لیتی ہے۔

سپہر آرا اگرچہ ایک آزاد خیال اور ترقی پسند کردار ہے لیکن یہ کوئی مثالی یا علامتی کردار نہیں ہے۔ اس کردار میں انیسویں صدی کی مٹتی ہوئی تہذیب کے تمام کردار موجود ہیں۔ وہ فال دیکھنا پسند کرتی ہے، خواب اور اس کی تعبیر پر یقین رکھتی ہے لیکن چھینک آنے یا بلّی کے راستہ کاٹ جانے پر بدکتی نہیں۔ وہ اپنی تمام بہنوں سے زیادہ شوخ، طرّار اور بے تکلف ہے۔ حسن آرا کے ساتھ شرط لگاتی ہے لیکن ہار جانے پر اُسے پورا نہ کرنا اُس کی فطرت ہے۔ ہمایوں فر کا نام آتے ہی ہندوستانی عورت کی طرح شرم و حیا سے پانی پانی ہو جانا اس کا شیوہ ہے۔ وہ تصنع، تکلف اور بناوٹ سے کوسوں دُور ہے۔

اللہ رکھی

فسانۂ آزاد کی بی بھٹیاری اللہ رکھی عرف ثریا بیگم عرف جوگن ایک بھرپور کردار ہے۔ اُسے آزاد سے عشق ہے۔ اُس کے بیوگ میں جوگن بن جانا، اس کی وفا شعاری اور سچی محبت کی زندہ مثال ہے اور جب ایک غیبی خزانہ اس کے ہاتھ لگتا ہے تو وہ اللہ رکھی سے

ثریا بیگم بن جاتی ہے۔ وہ دولت مند ہوجانے کے بعد بھی آزاد کے نام کی مالا جپتی رہی ہے اور اسی کے غم میں جوگن بن جاتی ہے۔ یہ اس کے عشق کی بے لوثی کا ایک تابناک پہلو ہے۔ اُسے اپنے عشق پر پورا بھروسہ ہے۔ اُس میں بلا کا عزم واستقلال ہے۔ اُسے پورا اعتماد ہے کہ اُس کا محبوب ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔

اللہ رکھی بھٹیارن بظاہر ہوس کی ماری ضرور نظر آتی ہے لیکن اعلا نسل اور گھرانے کی وجہ سے وہ حرص کا شکار نہیں ہوتی۔ اُسے اگر عشق ہے تو صرف آزاد سے۔ وہ ہر حال میں اسی کی مالا جپتی رہتی ہے۔ لیکن آزاد اُسے خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ صرف یہ سمجھتا ہے کہ دو ٹکوں پر جان دینے والی بھٹیارن عشق کی حقیقت کیا سمجھے۔

حسن آرا

حسن آرا فسانۂ آزاد کی ہیروئن ہے۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے زیادہ حسین، ذہین اور تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن یہاں بھی سرشار نے یہ کہیں ظاہر نہیں کیا کہ اس نے تعلیم کہاں حاصل کی۔

حسن آرا بلا کی حسین ہی نہیں روشن خیال بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سرشار کا آئیڈیل کردار ہے۔ یہ کردار اپنے عہد سے بہت آگے ہے۔ اگر ہم آج سے سو سال پہلے کے ہندوستانی سماج کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ حسن آرا ایک عام ہندوستانی عورت سے کس قدر مختلف ہے۔

حسن آرا ضعیف الاعتقاد بالکل نہیں ہے۔ وہ ہمارے سماج کی ہر کہنہ روایت کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں خود اعتمادی کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور دراصل اسی خود اعتمادی کے سہارے یہ کردار کھڑا ہے۔ حسن آرا عشق کو محض لذت نہیں بلکہ ایک نہایت مقدس جذبہ تصور کرتی ہے۔ یہاں وہ رومان انگیزی کے مغربی نظریے کی قائل نہیں۔ اگر وہ اس نظریے پر عمل کرتی تو اپنے جیسے بڑے گھر کے لڑکوں اور نواب زادوں سے ہر وقت نت نئے رومانس لڑاتی۔ لیکن اس نے دل بھی دیا تو ایسے پھکڑ کو کہ جس کے پاس دام نہ درم۔ دراصل حسن آرا نے اپنے محبوب کا دل دیکھا، اُس کی دولت نہیں۔ اس کے عشق کا جذبہ صادق ہے۔ وہ ہمارے قدیم سماج کی خواتین کی طرح اپنے عاشق کو امتحان میں ڈالتی ہے اور اس کی طاقت، ہمّت، شہ زوری اور بہادری کا امتحان لیتی ہے دوسرے معنی میں سوئمبر رچاتی ہے۔ اور جب وہ اس امتحان میں پورا اترتا ہے تو اس سے شادی کر لیتی ہے۔

حسن آرا فقط گفتار کی نہیں بلکہ کردار کی بھی غازی ہے۔ وہ صرف لیکچر دے کر سماج میں انقلاب لانے کی قائل نہیں بلکہ عملی طور پر سماجی اصلاح کے لیے خود بھی قدم اٹھاتی ہے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول بھی چلاتی ہے اور خود نہایت سادہ زندگی گزارتی ہے۔ وہ حقیقت میں بلند خیالی لیکن سادہ زندگی کے مقولے پر عمل کرتی ہے۔

اتنی خوبیوں کے باوجود ایک سوال قاری کے ذہن میں بار بار اُٹھتا رہتا ہے۔ کہ حسن آرا کا کردار اتنا روشن خیال کیونکر ہو گیا جب کہ اس نے نہایت قدامت پسند اور رجعت پرست ماحول میں تربیت پائی تھی، وہ کون سے عناصر تھے جس کے باعث حسن آرا کے عقائد، نظریات اور کردار نے تشکیل پائی؟ اس سوال کا جواب ہمیں فسانۂ آزاد میں نہیں ملتا۔

فسانۂ آزاد کی زبان

سرشار کا "فسانۂ آزاد" زبان، اسلوب اور طرزِ بیان کے اعتبار سے سند تصوّر کیا جاتا ہے۔ سرشار نے اسی فسانۂ آزاد کے ذریعہ اُردو کو نئے نئے محاورات، اصطلاحات اور اسلوبِ بیان کا ایک اچھوتا انداز بخشا۔ بقول صالحہ عابد حسین زبان سیکھنے کے لیے فسانۂ آزاد کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

فسانۂ آزاد میں سرشار کی زبان کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ تقلیدی انداز
۲۔ تخلیقی انداز

تقلیدی انداز

جہاں تک تقلیدی انداز کا تعلق ہے۔ فسانۂ آزاد کے ابتدائی حصے میں ہمیں رجب علی بیگ سرورؔ کے اندازِ بیان کی جھلک

نظر آتی ہے۔ منظر نگاری کرتے وقت سرشار سرور کی مسجع اور مقفیٰ زبان استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس تقلیدی انداز کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ سرور کے برعکس چیزوں کی بجائے انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی عکاسی بڑے بھرپور انداز سے کرتے جاتے ہیں۔ تقلیدی انداز میں سرشار کی زبان قدرے مشکل بھی ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ ساتھ ساتھ اشعار بھی استعمال کرتے جاتے ہیں۔ اگر کھانوں کا ذکر آتا ہے تو ایک سانس میں درجنوں کھانوں کے نام گنا جاتے ہیں۔ تعزیوں کا ذکر ہوتا ہے تو قلم کی ایک جنبش سے کئی قسم کے تعزیے پیش کر دیتے ہیں۔ پتنگ بازی کا ذکر کرتے ہیں تو آنِ واحد میں سو دو سو نام پتنگوں کے گنا جاتے ہیں۔ یہی اُن کے اندازِ بیان کی خصوصیت ہے۔

تخلیقی انداز

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تقلید سے تخلیق ہوتی ہے انسان تقلید سے سیکھتا اور تخلیق سے بنتا ہے۔ یہی حال پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ ان کے اسلوب اور تخلیقی اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فسانۂ آزاد میں ہر طبقہ کے کرداروں کو استعمال کیا ہے۔ کنجڑوں، خاکروبوں، نوابوں، حلوائیوں، نانبائیوں طوائفوں، ہیجڑوں، سادھوؤں، سناروں، سازندوں، مرچیوں، بیگموں غرضیکہ سماج کے ہر طبقہ کی زبان ان کے مخصوص انداز میں پیش کی گئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے لاتعداد اصطلاحات استعمال کی

ہیں۔ نئے نئے محاورے تراشے ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ ان کرداروں میں خود سرشار نہیں بلکہ ان کے کردار بولتے نظر آتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ سرشار کی طرزِ تحریر مشکل اور دقیق نثر سے ہے اور جگہ جگہ اشعار کی بھرمار ہے لیکن اس سے ہی اُن کی عظمت رفعت اور اندازِ بیان کی وسعت کا احساس ہوتا ہے۔

فسانۂ آزاد میں طنز و مزاح

مجموعی طور پر فسانۂ آزاد ہماری مٹتی ہوئی تہذیب اور جاگیردارانہ نظام پر ایک بھرپور طنز ہے۔ نوابوں کی عیاشی، ہوس پرستی اور خوجی کی جی حضوری اور خوشامد اس کی زندہ مثال ہے۔ سرشار طنز کرتے وقت اپنی رائے پیش نہیں کرتے بلکہ ہمارے سماج کے رستے ہوئے ناسور پر بڑی بے دردی کے ساتھ نشتر چلاتے جاتے ہیں۔

خوجی کے کردار میں ان بوڑھے ہوس پرستوں پر طنز کیا گیا ہے جو ہمیشہ ہوس پرستی کا شکار رہتے ہیں۔ آزاد کا کردار ہمارے سماج کی کہنہ رسوم پر پھبتی کستا نظر آتا ہے

جہاں تک سرشار کے مزاج کا تعلق ہے اس میں ہر قسم کا مزاح موجود ہے۔ مخول، ضلع جگت، پھبتی۔ ظرافت۔ مزاح، ٹھٹھول شوخی، پھکڑپن، غرضیکہ اس ترکش کے تمام تیر انھوں نے چلا دیے ہیں۔ اور اُن کا سب سے تیکھا تیر خوجی ہے اور اسی خوجی کی بدولت عبدالحلیم شرر کو بھی سرشار کی عظمت کا لوہا ماننا پڑا۔ انھوں نے ایک

خط میں سرشار کی تعریف کی تھی اور ساتھ یہ قطعہ تاریخ بھیجا تھا۔

تم نے نئی نکالی فسانے کی راہ واہ!
کن کن محاوروں کا کیا ہے نبـاہ واہ!
دیکھیں جو شوخیاں تیرے خامے کی غور سے
بولے شفیق واہ! عدو بولے آہ آہ
کرتا شرر ہے مصرعہ تاریخ پیشکش
کیا بول چال لکھی رتن ناتھ واہ واہ!

۱۲۹۸ھ

قصہ کوتاہ ہم فسانۂ آزاد کا فنی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُردو ادب کا یہ تابناک شاہکار تا قیامت تک قطبی ستارے کی طرح چمکتا رہے گا اور مستقبل کے علم و ادب کے قافلوں کو راہ دکھاتا رہے گا۔

سیرِ کوہسار

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا یہ ناول دو جلدوں پر مبنی ہے۔ اگرچہ یہ فسانۂ آزاد کی طرح طویل اور ضخیم نہیں۔ لیکن پھر بھی اس کا حجم اچھا خاصہ ہے۔ یہ ناول بھی اودھ اخبار میں فسانۂ لطیف کے عنوان سے قسط وار شائع ہوتا رہا تھا۔

اس ناول کی کہانی کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے :

ایک متوسط طبقے کے باعلم گھرانے کے نواب صاحب عیاشی اور بری صحبت میں گرفتار ہیں۔ یہ نینی تال جانے کا ارادہ کرتے

ہیں۔ لیکن دوران انھیں قمرن نامی منہارن سے عشق ہوجاتا ہے اور وہ اسے اپنے گھر ڈال لیتے ہیں۔ یہ ایک نہایت بدچلن بدمعاش اور اوباش عورت ہے۔ یہاں تک کہ ایک بار اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے للّو آبنولی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ کبھی قلفی والے سے آنکھیں لڑاتی ہے اور گلی کے لچّوں، لفنگوں اور شہدوں کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرتی ہے۔ اُس کی ایک بہن نازو بھی ہے۔ شکل وصورت میں تو وہ اپنی بڑی بہن جیسی ہی ہے لیکن طبیعت اور مزاج میں اس کے بالکل مختلف ہے۔ اگر نواب کے مصاحب ہراج سے عشق کرتی ہے تو اس کی بھی ہورہتی ہے۔ اُسے جھوٹے پتّے چاٹنے کا قطعًا شوق نہیں۔ نواب کی بیگم ایک پاک باز اور نیک عورت ہے۔ وہ اپنی آن پر کھیل جانا معمولی بات سمجھتی ہے۔ لیکن اپنی عزّت اور خاندان کی آبرو پر حرف آنا برداشت نہیں کرسکتی اور نہ وہ خودپسند ہے اور نہ خودنمائی کو پسند کرتی ہے۔ ایک بار بشیرالدولہ نامی کوئی شخص اس کی عزّت لوٹنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی ران میں چاقو گھونپ دیتی ہے۔ مگر نوّاب سے کچھ نہیں کہتی۔ صرف اسی لیے کہ کہیں اس کے خاندان کی آبرو مٹی میں نہ مل جائے۔

نوّاب اور قمرن نینی تال میں خوب عیش کرتے ہیں۔ آخر قمرن نواب کو چھوڑ کر کہیں اور بھاگ جاتی ہے۔ مگر پھر نوّاب کے ہاؤس لوٹ آتی ہے۔ اس کے بعد دوبارہ نکل بھاگتی ہے۔ اور اس بار وہ کہیں اور نہ جاکر کوٹھے کا سہارا لیتی ہے اور طوائف بن جاتی

ہے۔ نواب خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں بہت دُکھ ہوتا ہے۔ اُدھر نواب کی بیگم ایک سیدھی سادی عورت ہے۔ وہ یہ ساری بربادی ہنستے ہنستے برداشت کرتی ہے۔ آخر قمرن جب سخت بیمار پڑتی ہے تو ایک بار پھر نواب کے یہاں آکر پناہ لیتی ہے۔ نواب اپنی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے قمرن کو پھر سہارا دیتے ہیں۔ آخر نہایت تنگ دستی کے عالم میں قمرن مرجاتی ہے اور بیگم کا اُجڑا ہوا گھر پھر آباد ہوجاتا ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے سرشار کا ناول فسانۂ آزاد کے مقابلے میں زیادہ موثر اور پختہ ہے۔ البتہ اس کی زبان کمزور ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنّف نے کہانی کے پورے پلاٹ کو اپنی گرفت میں رکھا اور کہیں بھی اِدھر اُدھر نہیں بھٹکے اور نہ ہی کہیں جھول نظر آتا ہے۔ اس میں فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح ایک مزاحیہ کردار مہراج بھی ہے یہ نواب کا مصاحب ہے۔

جامِ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا یہ ایک اور ناول ہے۔ یہ ناول بھی سیرِ کوہسار کی طرح اودھ اخبار میں چھ ماہ تک " فسانۂ جدید" کے عنوان سے قسط وار چھپتا رہا اور بعد میں "جامِ سرشار" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کی کہانی بھی "سیرِ کوہسار" کی طرح ایک نواب کے گرد گھومتی ہے اور دراصل " سیرِ کوہسار" سے

بہت ملتی جلتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی "سیرِ کوہسار" کے ہیرو کی طرح ایک نواب ہے۔ جو جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ یہ عیاش ہے۔ چند چٹورے اور غنڈے نواب کے خوشامدی بن کر اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگتے ہیں۔ اس دوران اسے شراب نوشی کی لت پڑ جاتی ہے اور ظہورن نامی ایک کم ذات عورت نواب کی زندگی میں داخل ہوتی ہے جو اُسے جی بھر لوٹتی ہے۔ نواب دیوالیہ ہو جاتا ہے اور ظہورن طوائف بن جاتی ہے۔ نواب کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور وہ کنویں میں کود کر جان دے دیتا ہے۔

یہ ناول "سیرِ کوہسار" کے مقابلے میں دو اعتبار سے مختلف ہے۔ اوّل یہ کہ اس ناول کا نواب مے نوشں ہے۔ اس میں شراب نوشی کے بُرے نتیجے ظاہر کیے گئے ہیں۔ اس سرشار کا اپنا خاص کردار راوی زیادہ دیر تک سامنے نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو اپنے ماحول کا صحیح جائزہ لیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ ناول بہ یک وقت لکھنے کے باوجود رتن ناتھ سرشار کے ناول "جامِ سرشار" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ فسانۂ آزاد کے مقابلے میں صحافت کا رنگ نہیں آتا۔ اس کے ایک باب میں شرابیوں کی فطرت کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس باب میں سرشار کی کردار نگاری اپنے جوہر دکھاتی ہے اور زبان نے بھی اس ناول کے کرداروں کا پورا ساتھ دیا ہے۔ لیکن زبان و بیان

کا جو زور "فسانۂ آزاد" میں نظر آتا ہے اس ناول میں نہیں ملتا۔

کامنی

یہ سرشار کا ایک یک کرداری ناول ہے اور اس کا تانا بانا ایک ہندو گھرانے کے گرد بُنا گیا ہے۔ اس ناول میں سرشار ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو روایت سے سراسر بغاوت کرتا ہے اس ناول کی ہیروئن کامنی اپنی مرضی کے مطابق شادی کرنا چاہتی ہے لڑکی ہنس مُکھ بھی ہے اور شوخ بھی۔ اور طرّار بھی۔ آخر کئی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیل کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس کا خاندان رجعت پسند یعنی پُرانے خیالات کا حامی ہے اور اس کے افراد بات بات پر خاندان کی عزّت و آبرو کا واسطہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی خود کامنی کو بھی اپنے خاندان کی آبرو کا پاس ہے۔ اُس کی آن ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اُس کی آڑ میں وہ اپنے جذبات اور احساسات کا خون کرنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن پھر بھی کِس خوبی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے اور بغاوت کا جھنڈا بلند کرتی ہے۔ یہی اس ناول کی خصوصیت ہے۔

اس ناول کو فنی اعتبار سے کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ اس کے مطالعہ سے سرشار کے سماجی عقیدوں اور نظریوں پر روشنی ضرور پڑجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمارے سماج کے پرانے، فرسودہ اور کہنہ رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر لڑکے اور لڑکیاں اپنی پسند

کے مطابق لیکن والدین کی مرضی سے شادی کرلیں تو یہ ازدواجی رشتہ مستقل اور دیرپا ہوتا ہے۔ مگر اس کے لیے لڑکے اور لڑکی دونوں کا ہوشیار اور سمجھدار ہونا ضروری ہے۔

اس ناول میں ایک بڑی کمزوری ہے سرشار کو بیگماتی زبان پر قدرت حاصل ہے لیکن اس ناول کا ماحول ہندوانہ ہے۔ اس لیے بیگماتی زبان ہندوانہ ماحول کا ساتھ نہیں دیتی۔ اسی لیے ناول کے تمام کرداروں میں تصنّع اور بناوٹ کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ البتہ اس کے مطالعہ سے سرشار کے صحت مند اور ترقی پسند خیالات اور نظریات پر ضرور روشنی پڑجاتی ہے۔

پی کہاں

یہ سرشار کا ایک المیہ ناولٹ ہے۔ اس میں ایک ایسے شہزادے کی داستان بیان کی گئی ہے جو تپِ دق کا مریض ہے اور اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے وہ اپنے محبوب سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن وصال نصیب نہیں ہوتا۔ آخر یہی حسرت دل میں لیے وہ مرجاتا ہے۔ پی کہاں دراصل نہ ناول ہے نہ کہانی بلکہ ناول اور افسانے کے بیچ کی چیز ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سرشار المیہ یعنی ٹریجڈی کے مردِ میدان نہیں تھے۔ بلکہ وہ طنز ومزاح کے ذریعہ ماحول کو خوشگوار بنانے اور اسی کے ذریعہ اپنے دور کی عکاسی کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن اس ناول میں انھوں نے اپنی مخصوص روش سے ہٹ کر المیہ رنگ اختیار کیا ہے۔

اس ناول میں سرشار نے حزن ویاس کی اتنی فراوانی پیدا کی ہے کہ پتھر سے پتھر دل بھی موم ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ سرشار راوی کے کردار میں کہیں نظر نہیں آتے۔ بلکہ ساری کہانی کا پلاٹ صرف ایک ہی کردار کے بل بوتے پر کھڑا ہے اور اس کردار کے ہٹتے ہی ناولٹ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ سرشار زندگی کو محض پھولوں کی سیج ہی نہیں بلکہ کانٹوں بھرا راستہ بھی تصور کرتے تھے۔ اُن کی رائے میں زندگی محض مزاح اور ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑنے کا نام نہیں بلکہ کبھی کبھاُ نا امیدی، ترا شا اور کڑوے گھونٹ بھی نگلنے پڑتے ہیں۔ ایسے ہی کڑوے گھونٹ اُنھیں اپنی زندگی کے آخری دور میں پینے پڑے تھے اور انھوں نے مایوسی، بے چارگی، بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں دم توڑا۔

اس ناولٹ کے سارے ماحول میں مایوسی اور قنوطیت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

ہشو

اسے بھی ناول کی بجائے ناولٹ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ بھی "پی کہاں" کی طرح ایک یک کرداری ناولٹ ہے۔ اس میں رتن ناتھ سرشار نے ایک ہندو سیٹھ کا کردار پیش کیا ہے۔ جو شرابی ہے اور آخر کثرت مے نوشی کی وجہ سے بیمار پڑ جاتا ہے۔

یعنی بچے کر س اصلاح کا موجب بنتی ہے اور وہ شراب چھوڑ کر نہ صرف نیک بن جاتا ہے بلکہ مردِ مجاہد بھی۔ یعنی وہ شراب پینے اور شراب بیچنے والوں کی دُرگت بناتا ہے۔

اگرچہ زبان وبیان کے اعتبار سے یہ ناول انتہائی کمزور ہے لیکن فنیّ طور پر اسے کمزور نہیں کہا جاسکتا۔ اس ناول کا ایک ہی کردار پوری کہانی پر چھایا ہوا ہے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح "جامِ سرشار" اور" سیرِ کہسار" کے نواب، "پی کہاں" کا شہزادہ اور "کامنی" کی ہیروئن کامنی۔

اس ناول میں راوی کا کردار نظر نہیں آتا کیونکہ خود سرشار لالہ کے روپ میں موجود ہیں۔

سرشار کے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ ان کی باقی تصانیف کی طرح "ہشو" کا بھی ایک مقصد ہے یعنی شراب نوشی کے خلاف جہاد۔

مصنف" ہشو" کی کہانی کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور اس کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔ البتہ زبان وبیان کے اعتبار سے سرشار کی یہ کوشش سرے سے ناکام ہے۔

کڑم دھم

یہ بھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ایک ناولٹ ہے۔ اس کی ہیروئن نوشابہ کامنی کی طرح سماج کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ اس کی کہانی یوں ہے۔ نوشابہ

ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے جو نواب چھوٹے مرزا کے آوارہ، لچے اور لفنگے لڑکے سے شادی نہیں کرنا چاہتی کنبے والے بھی اس شادی کے خلاف ہیں۔ لیکن نوشابہ کا باپ نہیں مانتا۔ اسے اپنی لڑکی کے چال چلن پر شک ہو جاتا ہے۔ اس کا شبہ اس وقت دور ہوتا ہے جب نوشابہ کا نکاح اس کے پھوپھی زاد بھائی سے ہو جاتا ہے اور نواب صاحب منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

بظاہر اس کا پلاٹ "کامنی" سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن دراصل "کڑم دھم" میں سرشار نے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو تعلیم یافتہ ہے۔ اسی لیے وہ ایک آوارہ لچے اور لفنگے شخص سے شادی کر کے اپنی زندگی کو دوزخ بنانا نہیں چاہتی۔ نوشابہ اپنے والد کی جھوٹی اور کوری شان و شوکت کے آگے گھٹنے ٹیکنے کو تیار نہیں اسے اپنے باپ کی ضد کی بہ نسبت اپنا مستقبل زیادہ عزیز ہے۔

سرشار نے اپنے اس ناولٹ میں اپنے قارئین کو ایک نیا پیغام دیا ہے کہ لڑکیوں کو جھوٹی جاہ و ثروت کے عوض اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر والدین شادی بیاہ کے سلسلے میں کوئی غلط قدم اٹھائیں تو اس کے خلاف بغاوت کرنے سے بھی نہیں چوکنا چاہیے۔ زبان و بیان، کہانی کے موضوع اور اس کے برتاؤ کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سرشار نے اس میں کوئی خاص بات نہیں کہی۔

رنگے سیار

سرشار کے اس فسانے میں کوئی خصوصیت نہیں۔ اس میں صرف فسانۂ آزاد کی جلد اوّل کے ایک حصے کو قلم بند کیا گیا ہے تا کہ قارئین فسانۂ آزاد کی خوبیوں سے واقف ہو سکیں اور پورا ناول پڑھنے پر مجبور ہو جائیں۔

طوفانِ بے تمیزی

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ محسوس کرتے تھے وہ نہیں لکھتے تھے۔ بلکہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی تحریر کرتے تھے۔ یہی کیفیت "طوفانِ بے تمیزی" کی ہے۔ یہ "کڑم دھم"، "کامنی"، "پی کہاں" اور "ہشو" کی طرح ان کے رسالے "خم کدۂ سرشار" کی ایک کڑی ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک معمولی سی افواہ سے کتنا خطرناک فساد برپا ہو سکتا ہے اور اس کا نتیجہ کتنا تباہ کن نکلتا ہے۔ یہی اس کہانی کا مقصد اور موضوع ہے۔ یہ قصہ سرشار نے ۱۸۹۴ء میں "خم کدۂ سرشار" کے لیے تحریر کیا تھا۔ اس کی کہانی یوں ہے:

ایک دریا کے کنارے ہندوؤں کا کوئی تیوہار منایا جا رہا تھا کہ ایک ہندو طوائف اس میلے میں آئی وہ بھرے میلے میں سے گزرتی ہوئی مندر میں داخل ہو گئی ایک مسلمان غنڈے نے اس کا پیچھا کیا۔ اس نے اسے چھیڑا ہی تھا کہ اس طوائف کے ساتھ موجود ایک ہندو پہلوان لاٹھی سنبھال کر میدان میں کود پڑا۔ ان

کے ساتھ ہی گھاٹ والے پنڈت جی بھی ہتھیار لے کر اس عورت کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُدھر دوسری طرف گاؤں کے قریب کسی مسلمان کے گھر میں مولود شریف منایا جارہا تھا۔ وہاں چھوٹی ذات کے متعصب اور اَن پڑھ لوگ یکجا تھے۔ انھوں نے جب سُنا تو آوٗ دیکھا نہ تاوٗ، میلے کا رُخ کیا اور اس طرح ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ پولیس آئی مگر وہ موقع نہ سنبھال سکی۔ آخر ایک افواہ نے جنگل میں آگ کی طرح کام کر کے سارے شہر کو فساد کی لپیٹ میں لے لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو مسلمان آپس میں کٹ کٹ مرنے لگے۔ پولیس نے خوب رشوت لی اور وہ ایک طرف ہوگئی آخر فوج طلب کرنی پڑی تب کہیں یہ طوفانِ بے تمیزی تھما۔

یہ ایک واقعاتی افسانہ ہے۔ اس کی کوئی فنی خوبی نہیں۔ صرف مقصد یا موضوع جان دار ہے۔ کہانی میں کوئی گرفت نہیں، کوئی تسلسل نہیں۔ کہانی کا مقصد ساتویں باب میں ظاہر ہوتا ہے۔ زبان کہیں بھی کہانی اور کرداروں کا ساتھ نہیں دیتی البتہ سرشار نے پولیس اور فسادیوں پر تیکھا طنز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"فسادی تو آگ لگا کر بھاگ جاتے ہیں لیکن پھنس جاتے ہیں بے چارے شریف۔"

اس کہانی میں سرشار کا خاص کردار راوی بھی موجود ہے جو اپنے مخصوص انداز سے اپنے ماحول پر طنز کرتا ہے۔

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ "طوفانِ بے تمیزی" سرشار

کے زوال پذیر دور کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

سرشار کے افسانوں اور ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرشار کی شہرت ان کے شہرۂ آفاق ناول "فسانۂ آزاد" سے ہوئی اور اس ناول کی شہرت اور مقبولیت کے بعد ہی ان کے دیگر ناولوں کو لائقِ توجہ سمجھا گیا۔

ذیل میں ہم پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصانیف کی مکمل فہرست درج کر رہے ہیں:

تصانیفِ سرشار

تصنیف	موضوع
۱۔ فسانۂ آزاد (چار جلدیں)	ناول
۲۔ سیرِ کہسار (دو جلدیں)	"
۳۔ جامِ سرشار (دو جلدیں)	"
۴۔ کامنی	"
۵۔ پدمنی	"
۶۔ ہشو	ناولٹ
۷۔ پی کہاں	"
۸۔ طوفانِ بے تمیزی	کہانی
۹۔ کڑم دھم	ناولٹ
۱۰۔ بچھڑی دلہن	"
۱۱۔ گورِ غریباں	ناول (نامکمل)

تصنیف	موضوع
۱۲ - خدائی فوجدار	ناول (ترجمہ)
۱۳ - شمس الضحیٰ	(سائنس اور جغرافیہ (ترجمہ)
۱۴ - اعمال نامۂ روسو	سفرنامہ (ترجمہ)
۱۵ - رنگے سیار	کہانی
۱۶ - لارڈ ڈفرن کے لیکچر	(ترجمہ)
۱۷ - الف لیلیٰ	(ترجمہ)

تیسرا باب

سرشار کا فن

یوں تو عام طور پر مصوری، موسیقی اور سنگ تراشی کو ہم وسیع طور پر فن تصور کرتے ہیں لیکن ادبی طور پر ہم جب کسی ناول نگار کی کہانی کے پلاٹ، کردار نگاری، زبان اور طنز و مزاح وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اسے ناول کے فن کا نام دیا جاتا ہے۔

اس باب میں ہم سرشار کے ناول نگاری کے فن کا مجموعی طور پر جائزہ لیں گے۔

سرشار کا پلاٹ

یہ حقیقت ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے ذریعہ شہرت حاصل کی۔ لیکن اگر ان کے اس ناول کی کہانی یا پلاٹ پر نظر ڈالی جائے تو یہ پہلو نہایت کمزور نظر آئے گا۔ کیونکہ اس کا بیشتر حصہ بے ربط اور غیر مربوط نظر آئے گا۔ اس کی کوئی بھی کڑی ایک دوسرے سے جڑتی نظر نہیں آتی کہانی کی رفتار بہت سست ہے۔ اس کے برعکس ہم سرشار کے دوسرے ناولوں کا جائزہ لیں تو ہمیں

ان میں تسلسل اور ربط بھی نظر آئے گا۔ وہ مربوط بھی ہیں اور ان کی رفتار بھی معمول کے مطابق ہی محسوس ہو گی۔ کہانی کا پھیلاؤ بھی معقول ہے۔ البتہ "سیرِ کہسار" میں کہیں کہیں بے ربطی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی تیز رفتاری نے اس عیب کو کسی حد تک چھپا لیا ہے۔ اس کے علاوہ "جامِ سرشار" کی گرفت بھی مضبوط ہے۔" فسانۂ آزاد" اور "فسانۂ جدید" یعنی "جامِ سرشار" یہ دو ناول بہ یک وقت اودھ اخبار میں شائع ہونے کے باوجود "جامِ سرشار" کی گرفت زیادہ مضبوط نظر آتی ہے۔ جب کہ "فسانۂ آزاد" اس خوبی سے عاری ہے۔

جہاں تک قارئین کو حیرت میں ڈال دینے کا تعلق ہے یہ خوبی سرشار کے ایک دو ناولوں کے علاوہ سب میں موجود ہے بطورِ خاص "فسانۂ آزاد" میں یہ خوبی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں "فسانۂ آزاد" کے قارئین کی بے قراری اور تجسس کا یہ عالم ہوا کرتا تھا۔ کہ وہ حضرت گنج اور چوک بازار میں جمع ہو جاتے اور چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے۔ کہ سرشار آج کیا لکھیں گے۔ حیرت و تجسس کے اس احساس کے باعث ہی "فسانۂ آزاد" کو بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سعادت سرشار کے کسی اور ناول کو نصیب نہیں ہوئی۔ نہ ہی اتنی شہرت اُردو کے کسی دوسرے ناول کے حصّے میں آئی۔

سرشار کے باقی ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ اُن ناولوں میں تسلسل ضرور برقرار رہتا ہے۔ لیکن اُن کی گرفت کمزور ہی رہتی ہے "پی کہاں"، "کڑم دھم"، "ہشو" اور "طوفانِ بے تمیزی" میں یہ نقص

عام طور پر محسوس ہوتا ہے۔ ان میں حیرت و تجسس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ "فسانۂ آزاد" کے علاوہ سرشار کے ناولٹ "پی کہاں" کی رفتار بھی بے حد کمزور ہے اور حیرت کے احساس کا تاثر شروع میں ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

سرشار نے اپنی کہانی کے پلاٹ میں اگر کہیں نقطۂ عروج کو ابھارا ہے تو صرف "سیرِ کہسار"، "جامِ سرشار" اور "ہشو" میں۔ باقی افسانوں اور ناولوں میں یہ پہلو شدّت کے ساتھ ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ جہاں تک "فسانۂ آزاد" کا تعلق ہے اس میں نقطۂ عروج نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ "فسانۂ آزاد" سرشار کا شاہکار ناول ضرور ہے لیکن پلاٹ کی ظرافت اور نقطہ عروج دونوں پہلو کمزور ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کہانی کے ارتقا کے سلسلے میں سرشار کی خدمت کا اعتراف "فسانۂ آزاد" کے ذریعہ نہیں بلکہ اُن کی دیگر تصانیف کے وسیلے سے کیا جاسکتا ہے۔

سرشار کی کردار نگاری

سرشار نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جتنے بھی کردار پیش کیے ہیں ان سب نے زندگی کی صحیح ترجمانی کی ہے لیکن جہاں کہیں انھوں نے اپنے کرداروں کے ساتھ اپنے ماحول کا جائزہ نہیں لیا۔ اُن کے کردار حقیقت سے دُور بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ مثالی یا علامتی کردار بن جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کرداروں کی نفسیات جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اس سلسلے میں ہم خوجی اور

مہاراج بلی کے کرداروں کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں کردار بظاہر ایک نظر آتے ہیں۔ دونوں ایک ہی مٹتی ہوئی تہذیب کی علامت ہیں۔ لیکن خوجی میں یہ عنصر ہمیں کچھ زیادہ نظر آتا ہے۔ اس کی وفاداری، جی حضوری جاگیردارانہ نظام پر گہرا طنز ہے ایسے لوگ ہمیں آج بھی مل جاتے ہیں۔ دوسری طرف مہاراج بلی جی حضوری اور خوشامد میں طاق ضرور ہے لیکن وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ وہ ہر بات پر بڑ نہیں ہانکتا۔ اس کی عمر ۶۰ ساٹھ سال کی نہیں ہے، یعنی وہ سٹھیایا ہوا نہیں ہے۔ نہ ہی وہ پٹتا ہے۔ وہ بھی عشق کرتا ہے۔ جو اس دور کی خاص دَین ہے۔ دوسری طرف حسن آرا اور آزاد کے کردار ہمیں اس عہد کے نہیں۔ بلکہ آج کے زمانے کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ حسن آرا کا ایک رجعت پسند اور قدامت پسند ماحول میں تربیت پانے کے باوجود روشن خیالی کا دم بھرنا اور اپنے کردار اور علم کی بنا پر آگے بڑھ جانا عجیب سا نظر آتا ہے اور اُدھر آزاد کا آوارہ گرد ہونے کے باوجود آنکھ جھپکتے ہی مردِ مومن بن کر لیکچر بازی پر اُتر آنا بھی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ یہ تمام پہلو اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ان کا مثالی یا علامتی کردار ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سرشار نے اپنی تمام توجہ اور محنت خوجی کے کردار پر ہی صرف کی ہے۔

"سیرِ کہسار" اور "جامِ سرشار" میں سرشار نے جہاں نوابوں کے گھناؤنے پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ وہاں "سیرِ کہسار" کی بیگم میں ایک پاک دامن اور عصمت مآب بی بی کی خوبیاں

اور قرن میں بدذات عورت کی کمزوریاں بھی پیش کر دی ہیں۔ بات بات پر خفا ہو جانے کے باوجود فوراً من جانا بیگم کی معصومیت اور بھولے پن کی ترجمانی کرتی ہے مگر شوہر کی آن پر کھیل جانا اس کا شیوہ ہے۔ وہ پاک دامن بھی ہے اور اپنی عصمت کو کہیں بھی داغ دار نہیں ہونے دیتی۔ یہی اُس کی خوبی ہے۔

سرشار نے "جام سرشار" میں نواب امین الدولہ کے کردار میں وہ تمام کمزوریاں نمایاں کر دی ہیں جو عام طور پر ایک عیاش انسان میں پائی جاتی ہیں جو ارتقائی مراحل سرشار کے کردار نے طے کیے ہیں، خوجی کے علاوہ کسی اور کردار نے طے نہیں کیے۔

اسی طرح جام سرشار میں بھی بیگم کا کردار ہے۔ یہ بھی ایک شریف خاندان کی وفا شعار اور عزت مآب خاتون ہے۔ جو ہر قدم پر اپنے شوہر کو بچانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اس کی خاموشی ہی نواب کی عیاشی کا باعث ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کی وجہ سے نواب کی رسوائی ہو اور اسی خاموشی کے سبب اس کا گزارہ چلتا رہتا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے ایک ناولٹ "ہشو" میں ایک شرابی لالہ کا کردار پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا "ہشو" میں سرشار خود موجود ہیں۔ جو بلا کے مے نوش ہونے کے باوجود شراب اور شراب خوروں کی ہجو کرتے ہیں۔ لالہ کی غیر فطری حرکتیں کبھی کبھی ذہن پر بار بھی بن جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ مقصد صحت مند ہے لہذا یہ کڑوی گولی بھی نگلنی پڑتی ہے۔

سرشار نے اپنے کرداروں کو اکثر تعلیم یافتہ دکھایا ہے اور حسن آرا جیسا نسوانی کردار تو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کے لیے عملی اقدام اٹھاتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرشار بذاتِ خود خواتین کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیے جانے کے کتنے حامی تھے۔ یہی کیفیت اُن کے ہندو نسوانی کرداروں کی بھی ہے۔

سرشار کے کرداروں میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے کردار مصنف کے اشاروں پر نہیں ناچتے بلکہ اپنے افسانوں اور کہانیوں کے پلاٹ کے بل بوتے پر آگے بڑھتے ہیں۔ سرشار اُن سے غیر فطری حرکتیں نہیں کراتے اور نہ ہی وہ کٹھ پتلی کی طرح ناچتے ہیں بلکہ ان کے یہاں ہماری سماجی زندگی کی صحیح جھلک ملتی ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رتن ناتھ سرشار ماہرِ نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے بہترین نباض در ترجمان بھی تھے۔

سرشار کی زبان

سرشار نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اُردو ادب کو ایک خاص اسلوب اور زبان عطا کی۔ بول چال کا سلیقہ سکھایا۔ نئے نئے محاورے، الفاظ، اصطلاحیں اور نئی نئی بندش ہی نہیں بلکہ اُن کی ادائیگی اور محلِ استعمال کا ایک لاجواب، اچھوتا اور منفرد انداز

پیش کیا ہے۔

سرشار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طرزِ بیان سے منظر نگاری کی ایک لاثانی مثال پیش کی۔ اُن کی منظر نگاری میں چلتے پھرتے۔ بھاگتے دوڑتے، کھیلتے کودتے اور ہنستے بولتے انسان نظر آتے ہیں۔ میکانکی کھلونے نہیں۔ اشیا اور خریدار دونوں اُن کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اس کے علاوہ سرشار کے یہاں ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو ہمارے ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کو زبان عطا کی اور اس کا محلِ استعمال سکھایا۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ایسے کردار پیش کیے جو ہمارے سماج کے مختلف طبقوں کے صحیح معنوں میں ترجمان ہیں۔ مثلاً دھوبی، چمار، کنجڑے۔ بچے۔ نواب۔ سُنار۔ ساہوکار۔ ایکٹر وغیرہ۔

سرشار منظر نگاری کرتے وقت فصیح محاورے، بلیغ جملے۔ چُست بندشیں۔ بھڑکتے ہوئے اشعار اور فارسی کی دلکش ترکیبیں استعمال کرکے اپنے اندازِ بیان کو حسین سے حسین تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا منظر قارئین کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی فلم دکھائی جارہی ہو یا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرشار کا مشاہدہ بلا کا تھا۔

حق تو یہ ہے کہ جو مرتبہ اردو شاعری میں زبان و بیان کے اعتبار سے داغ، انیس اور نظیر اکبرآبادی کا ہے وہی مقام اُردو

نثر میں سرشار کو حاصل ہے۔ سرشار کی تحریروں سے اخذ کیے گئے نمونے کتاب کے آخر میں درج ضمیمہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سرشار کا طنز و مزاح

سرشار نے اپنی تحریروں میں طنز و مزاح سے بڑی لطیف چاشنی پیدا کی ہے۔

سرشار کے یہاں طنز و مزاح کی بہتات ہے۔ طنز کی بہترین مثال تو "فسانۂ آزاد" کا لازوال کردار خوجی ہے۔ اُس کا پستہ قد، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی۔ دُبلا پتلا چڑیا کی بیٹ جیسا جسم، سر پر ترکی ٹوپی، لال انگرکھا۔ لمبوترہ چہرہ، چھوٹے چھوٹے ہاتھ اور ایک نہ آدھ پوری ساٹھ سال کی عمر، جہاں بھی یہ پیرِ نابالغ حضرت خواجہ بدیع الزماں نظر آئے، باچھیں کھل اُٹھیں اور پھر اپنے بارے میں یہ غلط فہمی کہ ہر عورت اس پر مرتی ہے لاجواب ہے اور اکڑ بھی لاثانی ہے کیونکہ پیٹ پٹا کر قرولی نکالنے کی دھمکی خوجی ہی دے سکتا ہے اور پھر آنکھ جھپکتے ہی جی حضوری اور خوشامد کی زندہ تصویر بن جانا خوجی ہی کا کارنامہ ہے۔ یہ عناصر ایک زوال آمادہ تمدّن پر گہرا طنز ہی نہیں یہ اپنے دور کا صحیح نمائندہ بھی ہے۔ خوجی افیمی بھی ہے۔ ایسے افیمی جو اس عہد کے نوابوں کے دربار میں عام طور پر مل جاتے تھے۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے ایسے لوگوں پر یہ تیکھا وار ہے۔ یعنی یوں کہیے خوجی سرشار کا سب سے تیز نشتر ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو میاں آزاد کا کردار بھی ہمارے مغرب زدہ سماج پر ایک گہری چوٹ ہے۔ آج کے دور میں بھی آزاد جیسے آوارہ گرد عاشق عموماً بن جاتے ہیں جو اپنے محبوب کے ہر جا و بے جا حکم کو بجا لانا اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں اور جب کامیاب ہوجاتے ہیں تو اپنی محنت مزدوری کا صلہ شادی کی شکل میں وصول کرتے ہیں۔ سرشار نے ایسے سودے باز عاشقوں پر گہرا وار کیا ہے۔

علاوہ ازیں "جامِ سرشار" اور "سیرِ کہسار" کے نواب خود نوابی عہد پر کرداری چوٹ کرتے ہیں۔ ان کی عیّاشی، فضول خرچی اور شراب نوشی اس کی مثالیں ہیں۔

طنز کے علاوہ ہمیں سرشار کے یہاں مزاح اور ظرافت کے دلکش نمونے بھی ملتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہر قسم کی ظرافت پائی جاتی ہے۔ سنجیدہ طنز بھی ہے اور پھکڑّپن بھی۔ سنجیدہ مزاح ہمیں حسن آرا اور سپہر آرا کی نوک جھونک، ہمایوں فر کے مکالموں اور خوجی کے ساقی ناموں میں عام طور پر ملتا ہے۔ اسے پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بَل پڑجاتے ہیں۔

پھکڑپن کی مثال ہمیں سرشار کے اپنے مخصوص کردار راوی کی صورت میں نظر آتی ہے۔

سنجیدہ مزاح کی ایک اور عمدہ مثال "سیرِ کہسار" کے مزاحیہ کردار مہراج بلی کی بھی دی جاسکتی ہے۔ یہ کردار بظاہر ہمیں خوجی سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل یہ طنزیہ کردار کم اور

مزاحیہ زیادہ ہے۔ یہ ہر کسی پر اپنی میونسپلٹی کی دھونس جماتا ہے اور موٹے موٹے جملے ادا کر کے رعب بھی جھاڑتا ہے۔ اسے جغرافیہ سے نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسانوں سے محبت ہے۔

"فسانۂ آزاد" میں وکیل صاحب، بھٹیارنوں کی لڑائی، نواب کے دربار اور "ہشو" میں   کی اچھل کود ہمیں ہر غم کو بھلا کر بے اختیار قہقہے لگانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرشار اپنے فن کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ اگر انھوں نے رجب علی بیگ سرور اور سروانٹس کی تقلید کی تو اندھی نہیں بلکہ اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ اُن کا اچھوتا اسلوب انھیں کے ساتھ ابھرا اور انھیں کے ساتھ ڈوب گیا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے عہد میں فن کی جن بلندیوں کو چھوا اس کا ثانی نہیں ملتا۔

چوتھا باب

سرشار کی ادبی خدمات اور ان کا مرتبہ

سرشار نے اُردو دنیا کی جتنی خدمت کی اور مختصر زندگی میں جتنا لکھا اور جس ڈھنگ سے لکھا اسی کے باعث انھیں اُردو کا ایک ممتاز اور اہم مصنّف کہا جاتا ہے بلکہ انھیں ایک عہد آفریں شخصیت سمجھنا چاہیے۔ اُن کی ادبی خدمات کو ہم کسی طور پر بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ سرشار کی ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل عناصر کا تجزیہ کرنا پڑے گا۔

سرشار بحیثیت ناول نگار

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے علاوہ کچھ اور ناول بھی لکھے تھے۔ جن میں "سیرِ کہسار"، "جامِ سرشار"، "کامنی" بے حد مشہور ہوئے۔ "سیرِ کہسار" اور "جامِ سرشار"، "اودھ اخبار" اور باقی ناول دوسرے رسالوں میں قسط وار شائع ہوتے رہے اور بعد میں انھیں کاٹ چھانٹ کر کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ لیکن یہ ناول مربوط ہیں اور ان کی گرفت بھی مضبوط ہے۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ ان میں پلاٹ ہوئے اور
ان میں حیرت کا احساس پیدا کرنے کی بھی خوبی ہے " فسانۂ آزاد"
کی طرح ان کی کہانی سپاٹ نہیں اور ان تمام ناولوں کو ایک ہی
نشست میں ختم کر ڈالنے کو جی چاہتا ہے۔ اُن کی گرفت بھی بہت
اچھی ہے اور کردار نگاری بھی عمدہ ہے۔ اُن کے کردار ڈرامائی
انداز سے اُبھرتے ہیں۔ " سیرِ کہسار" اور " جامِ سرشار" کے نواب اور
مہراج بلی کے ساتھ ساتھ " فسانۂ آزاد" کا خوجی جیسے کردار قارئین
کے دل و دماغ پر اپنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

سرشار کے ناولوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُن میں جزئیات
نگاری درجۂ کمال کو پہنچ گئی ہے۔ چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کی
عکاسی کرنے میں بھی انھیں ملکہ حاصل ہے اور اسی باعث اُن
کے فن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

سرشار کے ناولوں کا پھیلاؤ بھی لائق ذکر ہے جو ناول کے
فن کا بخوبی احاطہ کر لیتا ہے۔

سرشار کو منظر نگاری میں کمال حاصل ہے۔ وہ تشبیہہ استعارے
کنایہ اور اشارے، مشکل الفاظ اور اشعار کے برمحل استعمال کے
ذریعہ اپنے ماحول کی سچی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

سرشار کے فن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے
کرداروں پر پند و وعظ کے دفتر نہیں کھولے اور جہاں بھی
انھوں نے پند و وعظ کا سہارا لیا وہیں ان کے کردار لنگڑے
لولے ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر وہ اپنی بات طنز و مزاح کے

تیر چلا کر ہی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کی مٹتی ہوئی تہذیب اور تمدّن کی صحیح معنوں میں عکاسی کی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب میں صحافتی ناول یعنی سیریئل ناول کی شروعات سرشار نے ہی کی۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے چند ناولٹ بھی لکھے۔ ان میں "ہشّو"، "پی کہاں"، "کڑم دھم" وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں سرشار نے ناول کے فن کی طرح کسی کردار کی پوری زندگی پر روشنی ڈالنے کی بجائے ناولٹ کے فن کی طرح کسی واقعہ کو ڈرامائی انداز سے درمیان میں سے اٹھایا ہے اور اسی کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ہشّو" ایک کردار پر مبنی ناولٹ ہے اور باقی واقعات پر"پی کہاں" ایک عشقیہ ناولٹ ہے اور المیہ بھی اور ان کے باقی تمام ناولٹ غم و الم کی دنیا سے دور ہیں۔ اُن میں چھوٹے چھوٹے ابواب میں ناولٹ کی کہانی کو اُبھارا گیا ہے۔ "پی کہاں" کا المیہ دلوں پر گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اگرچہ اُس کا مقصد نہیں اُبھرتا۔ لیکن سرشار نے اس المیہ ماحول کی منظر نگاری خوب کی ہے۔ اس طرح "ہشّو" بھی شراب نوشی کے خلاف مہم کے سلسلے میں زبردست محاذ کھولتا ہے۔ اس کوشش کو ایک مثالی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اُردو ادب میں سرشار نے ہی سب سے پہلے ناولٹ نگاری کی ابتدا کی ہے۔

سرشار بحیثیت افسانہ نگار

سرشار نے "بچھڑی دلہن"، "طوفانِ بے تمیزی" اور "رنگے سیار" کے عنوان سے چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے۔ جنھیں سرشار کے افسانے کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں کہانی کی تکنیک کی کوئی خوبی نہیں ملتی۔ دراصل نہ یہ قصہ ہیں نہ افسانہ اور نہ ہی ناولٹ۔ اگر ہم انھیں افسانے کہیں تو ان کی ترتیب چھوٹے چھوٹے ابواب میں کی گئی ہے اور سارے پلاٹ کو اسی انداز سے نبھایا گیا ہے اور ان میں ایک نہیں بلکہ دو دو کلائمکس آجاتے ہیں۔ اگر ہم انھیں ناولٹ کہیں تو ان کا احاطہ نہیں ہوتا۔ یہ اتنے مختصر ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خاکہ سا کھینچ دیا گیا ہے۔

"طوفانِ بے تمیزی" میں افسانہ نگار کا مقصد واضح ہے لیکن اُن کے باقی افسانوں کا مقصد بھی واضح نہیں ہے۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے سرشار کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس سے نہ تو افسانے کے فن کو تقویت ملتی ہے اور نہ ہی سرشار کے فن کی کوئی اچھی تصویر ابھرتی ہے۔ بلکہ اس پہلو پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اُن کے زوال پذیر دور میں بے اعتدالی لاپرواہی اور فنی زوال کس حد تک پہنچ گیا تھا۔ ان تخلیقات سے اُن کا تجزیہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

سرشار بحیثیت شاعر

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کے میدان میں اپنی عظمت کا سکّہ خوب چلایا۔ لیکن وہ شاعر بھی معمولی درجے کے تھے، شاعری کے میدان میں جو گوہر افشانیاں انھوں نے کیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے روایت سے بغاوت کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر اُن کی مثنوی تحفۂ سرشار اور قصیدہ "طوفانِ سرشار" قابلِ ذکر ہے۔ اس ضمن میں ہم سرشار کی غزل گوئی قطعات، رُباعیات اور تاریخوں کے علاوہ مذکورہ مثنوی اور قصیدہ کے محاسن پر روشنی ڈالیں گے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے۔ اور اسیر اُردو کے مشہور شاعر مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

اگرچہ سرشار اپنی شاعری کی وجہ سے زیادہ مقبول نہیں ہوئے لیکن انھوں نے اپنی غزلوں، قطعوں، رباعیوں، تاریخوں، قصیدے اور مثنوی کے ذریعہ جو شعری خدمات انجام دیں۔ اُن کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ایک پختہ گو اور صاحبِ ذوق شاعر تھے۔ اُن کی زبان نہایت صاف اور فصیح تھی۔ روزمرہ اور محاورہ بندی کا انھیں ہمیشہ پاس رہتا تھا۔ لیکن مثنوی اور قصیدے کے سوا اُن کی پوری شاعری روایتی نظر آتی ہے۔ اُن کا یہ شعر دیکھیے کتنا خوبصورت ہے ؎

حال سب میری سخت جانی کا　　باڑھ کہتی ہے مُڑ کے خنجر سے

اس میں ایک لفظ " باڑھ " ہی نے پورے شعر میں حسن پیدا کر دیا ہے، یہاں باڑھ کا دو معنی استعمال قابل غور ہے۔

سرشار کی غزل گوئی میں خالص لکھنوی رنگ نظر آتا ہے اور انداز بھی روایتی ہے۔ الفاظ کی نشست اور برخاست، ردیف کی چستی اور قافیہ کی برجستگی قابلِ داد ہے۔ اور زبان کے چٹخارے کا تو جواب نہیں۔ مثلاً

بتوں کے در پہ سب کی جبّہ سائی ہوتی جاتی ہے
انھیں کے قبضے میں ساری خدائی ہوتی جاتی ہے
شکایت پر کدورت کی دکھاتے ہیں وہ آئینہ
اشارہ ہے کہ اب دل میں صفائی ہوتی جاتی ہے

مندرجہ ذیل شعر کی تشبیہہ کا جواب نہیں۔

بحرِ عالم میں ہم ہیں مثلِ حباب
اپنا بگڑا بنا نہیں معلوم

اور اس شعر کا جواب کہاں ملتا ہے :

خضرِ راہ کو حال خود اپنا
صورتِ نقشِ پا نہیں معلوم

جہاں تک سرشار کی تاریخ گوئی کا تعلق ہے انھوں نے اپنی تاریخوں میں حروف ابجد کے اعتبار سے بہ یک وقت سنِ عیسوی اور سنِ ہجری کی تاریخیں نکالیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایک تاریخ میں جدت طرازی بھی دکھائی۔ یہ تاریخ انھوں نے پنڈت بشمبر ناتھ سیرو صابر کی کتاب تزکِ جرمنی کی اشاعت پر کہی تھی۔ اس میں ہر شعر کے

مصرعے کی تکرار قابلِ توجہ ہے اور اس الٹ پھیر نے اس تاریخ کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے مثلاً دو شعر ملاحظہ کیجیے:

شاعرِ شیریں زباں، صابرِ معجز مقال
صابرِ معجز مقال، شاعرِ شیریں زباں
بلبلِ رنگیں بیاں، قمریِ باغِ سخن
قمریِ باغِ سخن، بلبلِ رنگیں زباں

پوری تاریخ اسی اہتمام سے کہی گئی ہے۔

سرشار اپنے اُستاد کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ منشی اسیر خالی اُستاد نہ تھے بلکہ اُستاد گر تھے۔

سرشار کے قطعات، رباعیات اور متفرق اشعار دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا زورِ قلم اپنے شباب پر تھا۔ عام طور پر اُردو شاعری پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ ہندوستانی تہذیب و تمدّن کی بُوباس سے عاری ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سرشار ہی کے دو اشعار اس امر کے ترجمان ہیں کہ ہمارے ہندوستانی تہذیب اور تمدّن کی نمائندگی کس حد تک ہوتی ہے:

گھٹا کالی کالی دھنک لال لال
کنہیا کی ابرو پہ جیسے گلال

گھٹا اور بجلی میں ہے آج چوٹ
ہے آئی دوپٹے میں لچکے کی گوٹ

سرشار کے یہاں لکھنؤ کی روایتی آن بان۔ تشبیہ اور استعارہ کی

شان و شوکت، کنایہ کا پُرتکلف استعمال اور تکرار لفظی اور تضاد کا حسن بھی پایا جاتا ہے۔ سرشار کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں کے اشتہار بھی نظم کیے۔ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں شائع ہونے والے ایک رسالے "خمکدۂ سرشار" کے اوّلین شمارے میں اپنے ناول "کامنی" کا ایک منظوم اشتہار شائع کیا اور اس اشتہار کا سنِ تحریر ہجری میں نکالا۔ اس میں ایک عمدہ اشتہار کی تمام خصوصیات کے ساتھ ایک اچھی نظم کے تمام محاسن بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اس کے دو چار اشعار دیکھیے:

ہر روش پر ہو بلبلوں کی پکار — لو مبارک ہو آئی فصلِ بہار
شاہدِ گل ہے خوب جوبن پر — بوئے گل ہے ہوائے توسن پر
کیوں نہ لپٹے گا گل سے بلبلِ زار — کہ غنیمت وقتِ بوس و کنار

بزم میں بات وہ نکالی ہے — شعر ہیں یا گلوں کی ڈالی ہے
مثلِ شمشاد شعر اکڑتے ہیں — منھ سے خامے کے پھول جھڑتے ہیں

ریختے کا بھی رنگ ہے اس میں — ریختی کا بھی ڈھنگ ہے اس میں

ہاں مگر ایک بات یاد رہے — اس میں جو چاہے کوئی ہم کو کہے
نہ کہیں پائیے گا فحش کا نام — کہ بہو بیٹیوں کا ہے یہ کلام
اگلے وقتوں کی ریختی تھی اور — خان صاحب کا اب نہیں ہے دور

مثنوی تحفۂ سرشار

اس سے قبل سرشار کی مشہور مثنوی تحفۂ سرشار پر بحث کی جائے مثنوی کی تکنیک کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ دراصل مثنوی کے لغوی معنی دو دو کے ہیں۔ اس میں اخلاقی یا عشقیہ قصے اور داستانیں نظم کی جاتی ہیں۔ اس کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں یوں تو مثنوی کی ابتدا عربی سے ہوئی لیکن عربی شاعری میں شعراء نے مثنوی کے فن میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔ البتہ فارسی شاعری میں فردوسی کا شاہنامہ اور مولانا روم کی مثنوی اس صنفِ سخن میں گراں قدر ادب پارے ہیں۔

مثنوی میں عام طور پر افسانے کی طرح کردار نگاری ہوتی ہے اور قصہ کا ارتقا ہوتا ہے۔ اس میں ہر واقعہ اور ہر کیریکٹر میں ہم آہنگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہ خوبی ہمیں فارسی شاعری سے حاصل ہوئی۔ اُردو مثنوی فارسی شاعری سے بے حد متاثر ہے۔ میر حسنؔ کی مثنوی "سحرالبیان" اور دیاشنکر نسیمؔ کی "گلزارِ نسیم" نے ہماری اُردو شاعری کو چار چاند لگائے۔

ہمارے شاعروں نے روایتی انداز سے مثنوی کی صنف میں عشق و محبّت کے قصّے نظم کیے۔ ان میں غیر فطری کرداروں اور ماحول کو زیادہ دخل رہا ہے اور ہماری کلاسیکی شاعری نے بھی عشق کی لچھمن ریکھا سے آگے بڑھنے کی جسارت نہیں کی۔ لیکن رتن ناتھ سرشار نے روایت سے سراسر بغاوت کی ہے۔ انھوں

نے اپنی اس مثنوی میں حصولِ علم کا ایک صحت مند نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق و محبت کی فرسودہ داستان نہیں ملتی۔ اور نہ ہی ان کے کردار کوئی کرامت دکھاتے ہیں۔ وہ جنوں بھوتوں اور دیووں کا سامنا نہیں کرتے بلکہ وہ سماج کی ہر ایک بدعت کا مقابلہ کرتے ہیں اور زندگی کی صحت مند قدریں پیش کرتے ہیں۔ بنی نوعِ انسان کو اس دنیا کی اسٹیج پر اپنا رول کس طرح انجام دینا چاہیے، یہی اس نظم کی خوبی ہے۔ اس کا ہیرو ہمارے سماج کا ایک نمائندہ ہے جسے حصولِ علم کا چسکا لگ چکا ہے۔ کس طرح وہ ہمارے فرسودہ سماج کی کہنہ رسوم کے خلاف بغاوت کر کے کسی حیلے انگلینڈ پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے بیرسٹری کی سند حاصل کر کے اپنے وطن لوٹتا ہے۔ لندن میں رہ کر وہ کس طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے اور وہ کیسے سماج کی خدمت کو اپنی زندگی آدرش بنا لیتا ہے۔ یہی اس مثنوی کا خلاصہ ہے۔ اس نظم کے ہیرو میں بھی بلا کا عزم اور استقلال ہے۔ اُس میں علم و عمل کی قوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اس مثنوی میں جہاں نوجوانوں کی قوتِ عمل اور مردانگی کو اُبھارا گیا ہے۔ وہاں ہمارے سماج کی کہنہ اور بوسیدہ رسموں کو توڑنے والے نوجوانوں کو سمندر پار جانے میں کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا شاعر نے اس پر بھی بڑے خوبصورت انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ نظم بے حد کامیاب ہے

اور کہیں بھی غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ سرشار نے اپنی روایت کو یہاں بھی نہیں توڑا یعنی انھوں نے یہ نظم بھی قلم برداشتہ لکھی تھی۔

قصہ مختصر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے مثنوی "تحفۂ سرشار" کے ذریعے علم و عمل کی راہیں کھولیں۔ نوجوانوں کے لیے سمندر پار جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جواز ہی نہیں نکالا بلکہ اس کے لیے میدان بھی ہموار کر کے ہمارے سماج میں صحت مند قدروں کا اضافہ کیا۔

قصیدہ "طوفانِ سرشار"

قصیدے کے لغوی معنی مغز اور گودے کے ہوتے ہیں۔ لیکن اصنافِ سخن میں یہ وہ صنفِ شاعری ہے کہ جس میں شاعر کسی کی تعریف یا بُرائی یا ہجو میں نظم لکھتا ہے۔ قصیدے کی تکنیک کے مطابق یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ بظاہر یہ صنف غزل سے ملتی جُلتی ہے یعنی قصیدے میں غزل کی طرح اشعار ہوتے ہیں۔ مطلع بھی ہوتا ہے اور باقی شعر ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ لیکن قصیدہ چونکہ ایک ہی نظم کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے اس میں کئی مطلع ہوتے ہیں لیکن مقطع کہ جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، ایک ہی ہوتا ہے۔ قصیدے میں شعروں کی تعداد کی پابندی نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے قصیدے میں تمہید ہوتی ہے۔ اُس کے بعد تشبیب پھر گریز اور آخر میں دعا۔ کئی قصیدے فقط خطابیہ ہوتے ہیں۔ اُن

یں شاعر اپنا مقصد شروع ہی میں بیان کرتا ہے۔ قصیدہ میں شاعر کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے۔ کہتے ہیں قصیدہ گوئی سودا پر شروع ہوئی اور ذوق پر ختم ہوگئی۔ لیکن سرشار کا یہ قصیدہ روایت سے سراسر بغاوت کا پتہ چلتا ہے۔ قصیدہ "طوفانِ سرشار" ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی کشمیری پنڈتوں کی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیری پنڈتوں کی برادری کی آڑ میں پورے ملک اور قوم کی تعریف کردی۔ قوم کے بے غرض خدمت گاروں کا تذکرہ بڑے پُرخلوص انداز سے کیا اور انھوں نے روایتی قصیدہ گوئی کے برعکس اپنے ملک اور قوم سے مال وزر، جاگیر یا انعام کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ پیار و محبّت، دوستی، رواداری اور اتحاد کا پیغام دیا۔ سرشار نے رجعت پسندی کو فروغ نہیں دیا بلکہ صحت مند اور ترقی پسند سماجی رجحانات اور قدروں کو بڑھاوا دیا ہے۔

فنّی اعتبار سے اس قصیدے کی کئی خوبیاں ہیں۔ اس کی تمہید نہایت دلکش انداز سے باندھی گئی ہے۔ پھر تشبیب کے اشعار ہیں۔ اُس کے بعد شاعر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پھر ملک اور قوم کی تعریف کی گئی ہے اور آخر میں اتحاد اور محبّت کی تلقین کے بعد دعا کے ساتھ یہ قصیدہ ختم ہوجاتا ہے۔

مذکورہ مثنوی اور قصیدے کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرشار ایک بے مثل ادیب ہی نہیں بلکہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل ریفارمر بھی تھے۔ اُن کی شاعری اسی پہلو کی بدولت زندہ ہے۔

سرشار بحیثیت مترجم

سرشار اپنے عہد میں بہترین مترجم تصور کیے جاتے تھے منشی نول کشور نے تاریخ روسیہ کے دیباچے میں لکھا ہے :

" جب میں نے پہلے پہل اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو میرے دماغ میں کچھ شکوک پیدا ہوئے کہ اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے کون سے بہترین شخص کو بحیثیت مترجم کے ملازم رکھا جائے ۔ آخر میں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ اس کام کو اودھ اخبار سے وابستہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سپرد کیا جائے اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُن کے ترجمہ کو موزوں اور باصلاحیت ججوں نے تسلیم کرلیا ہے "

سرشار نے ترجمہ کے فن کو عروج بخشا۔ انھوں نے کبھی لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ترجمہ کی خشکی کو دور کرنے کے لیے جا بجا اشعار شامل کیے۔ اس لیے اس کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا ۔ خدائی فوجدار کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے تاریخ روسیہ اور شمس الضحیٰ کے علاوہ لارڈ ڈفرن کے لیکچر کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ مشرقی اور مغربی فنون کے ادبی جواہر پاروں کو بھی اُردو میں منتقل کیا انھیں خوبیوں کے باعث سرشار کو اُردو کے مترجمہ ادب میں ایک سنگِ میل کہا جاتا ہے۔

سرشار بحیثیت صحافی

ایک کامیاب صحافی کے لیے جہاں ایک اچھا مترجم ہونا لازمی ہے۔ وہاں اخبار کی دُنیا میں اکثر عوام کے ذوق کو دیکھا جاتا ہے اور یہی کوشش کی جاتی ہے کہ پرچہ کو حتی الامکان مقبول بنایا جائے اور اس کی اشاعت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اکثر قارئین کم از کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اور پُراز معلومات مضامین پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس وقت ایک اچھے صحافی کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے عمدہ مضامین اور افسانوں کے ترجمے بھی اپنے پرچے میں شائع کرے۔ یہ تمام خوبیاں سرشار میں بے پناہ تھیں۔ انھوں نے جو پرچہ نکالا اس میں دوسری زبانوں کی شاہکار تخلیقات کا ترجمہ بھی شائع کیا۔

ایسے ہر پرچہ کو مقبول بنانے کے لیے انھوں نے ایک نہ ایک ناول کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا "اودھ اخبار" میں انھوں نے "خدائی فوجدار" کے علاوہ "فسانۂ آزاد"، "جامِ سرشار" اور "سیرِ کہسار" ناول قسط وار شائع کیے۔ "خمکدۂ سرشار" میں "کامنی"، "پدمنی"، "پی کہاں"، "ہشو"، "طوفانِ بے تمیزی"، "کڑم دھم" اور "بچھڑی دلہن" لکھے۔ یہاں تک کہ اُن کا آخری نامکمل ناول حیدرآباد سے اُن کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے اخبار "دبدبۂ آصفی" میں قسطوار چھپتا رہا۔ جب وہ "اودھ اخبار" کے اڈیٹر تھے تو لوگ ہمیشہ منتظر رہا کرتے تھے کہ سرشار آج "اودھ اخبار" میں کیا لکھیں گے۔ یعنی

یوں کہیے کہ "فسانۂ آزاد" کے ذریعہ "اودھ اخبار" کی اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

ایک اچھے ایڈیٹر کی یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ مختلف ادیبوں اور شاعروں سے اُن کی عمدہ تخلیقات حاصل کرنے میں بھی وہ کامیاب ہو۔ سرشار میں یہ خوبی بھی موجود تھی۔ اور وہ شاعروں اور مضمون نگاروں سے اعلیٰ تخلیقات بھیجنے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

کامیاب صحافی کی ایک خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مزاج کو شگفتہ رکھے۔ وہ پرچہ کو اپنی قابلیت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ شگفتہ مزاجی کے ذریعہ بھی مقبول بناتا ہے۔ سرشار میں یہ خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنی باغ و بہار شخصیت سے پوری محفل پر چھا جاتے اور ساری بزم کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ انھیں خوبیوں کے باعث کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار اُردو صحافت کے اہم ستون تھے۔

سرشار کا ادبی کارنامہ

سرشار نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سیاسی اعتبار سے افراتفری کا دور تھا۔ اودھ کی سلطنت ختم ہوچکی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اپنے دن پورے کرچکی تھی اور اب اودھ کی حکومت کی باگ ڈور تاجِ برطانیہ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔ مشرقی تہذیب کا سورج غروب ہوچکا تھا۔ اور مغربی تہذیب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے سماج کا ایک لازم جزو بنتی جارہی تھی۔ اور اودھ

انگریزی تعلیم کے چلن سے ہندوستانی مغربی علوم مطالعہ کرنے لگ گئے تھے۔

سماجی طور پر بھی ایک نئے ہندوستان کی تصویر اُبھر رہی تھی۔ ایک طرف انگریز نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستان میں نفرت اور پھوٹ کا بیج بو دیا تھا اور دوسری طرف عیسائیت کا پرچار بھی زور وشور سے جاری تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی اصلاحات کے ذریعہ بھی ہندوستان کا رنگ روپ نکھارا اور سنوارا جا رہا تھا۔ ستی کے رواج اور بچپن کی شادی پر پابندی لگ چکی تھی۔ تعلیم نسواں کی تبلیغ زور شور سے ہو رہی تھی۔ نئے نئے اخبارات جاری ہوئے تھے۔ نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی تھیں اور کل کارخانے لگائے جا رہے تھے۔

سرشار نے جس ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اُس وقت ادب کے اُفق پر رجب علی بیگ سرورؔ کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اُس کی تخیّلی قصّہ گوئی۔ الفاظ کی رنگینی اور لچھّے دار زبان دلوں پر حکومت کر رہی تھی۔ سرورؔ کا یہ انداز زندگی کا کوئی صحت مند تصور پیش نہیں کر رہا تھا۔ میر امّنؔ اور شیر علی افسوسؔ اپنے ادب کو فقیروں اور درویشوں اور بادشاہوں کے حجروں اور محلّات تک مقیّد کیے ہوئے تھے۔ سرشار کے اپنے ہی عہد میں ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شررؔ، منشی سجّاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف جیسی اعلا ادبی ہستیاں بھی موجود تھیں۔ مگر نئی اور پرانی تہذیب کے سنگم پنڈت رتن ناتھ سرشار ہی تھے۔ وہ ایک طرف

مٹتی ہوئی مشرقی تہذیب کے نمائندے تھے تو دوسری طرف آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے مغربی تمدّن کے نقیب بھی۔ دراصل انھوں نے اپنے عہد کی صحیح معنی میں عکاسی اور ترجمانی کی۔ طنز و مزاح کے نشتر بھی چلائے اور فرسودہ مشرقی تہذیب کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کی۔ انھوں نے ہمارے سماج کے رستے ہوئے ناسور سے سارا گندہ مواد نکالنے کی کوشش کی۔ یہاں پنڈت برج نرائن چکبست کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ سرشار اُردو نثر کے حالی تھے۔ یعنی اُردو شاعری میں حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ جو نئی راہ نکالی۔ عین یہی کیفیت سرشار نے سب سے پہلے اُردو ادب کو منظر کشی اور عکاسی کے صحت مند عناصر عطا کیے۔ بقول پنڈت بشن نارائن رعد سرشار ایک شاعر کا دماغ اور مصوّر کی آنکھ لائے تھے۔ ان کے طنز و مزاح نے وہی کام کیا جو ایک ناصح یا لیڈر بھی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اُردو ادب کو نہایت صاف ستھرا مذاق عطا کیا۔

یہی نہیں بلکہ اُن کے کردار اُردو ادب میں کردار نگاری کے مثالی نمونے ہیں۔ خاص طور پر خوجی کا کردار۔ دراصل "فسانۂ آزاد" کا نام ہی فسانۂ خوجی ہونا چاہیے تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر فن کار اپنے بعد آنے والے فن کاروں کو متاثر کرتا رہتا ہے اور اُس کا فن تحریک دیتا رہتا ہے۔ اگر ہم عصر فن کاروں میں بھی یہ کیفیت ہو تو سونے پر سہاگے والی بات ہو جاتی ہے۔ منشی سجّاد حسین نے خوجی کے کردار سے متاثر ہو کر حاجی بغلول کا کردار پیش کیا اور اسے "اودھ پنچ" میں قسط وار شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا

کا جاندار، بھرپور اور خوبصورت کردار پیش کیا۔ لیکن خوجی والی کیفیت اُن کے یہاں بھی پیدا نہ ہو سکی۔

اُردو افسانے میں منشی پریم چند کو میر کارواں کی حیثیت حاصل ہے۔ پریم چند کے فن پر سرشار اور شرت چندر کا اثر زیادہ ہے۔ سرشار کے "فسانۂ آزاد" ہی سے تحریک پا کر انھوں نے حقیقت نگاری کی۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ رتن ناتھ سرشار سے تو سیری نہ ہوتی تھی۔ اُن کی تمام کتابیں انھوں نے پڑھ ڈالیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے "آنار کتھا" کے نام سے ہندی میں فسانۂ آزاد کا دو حصوں میں ترجمہ کیا تھا۔ سرشار کی طرح پریم چند بھی ہمارے سماج پر طنز کرتے ہیں اور طنز کرنے کا سلیقہ انھوں نے سرشار سے ہی سیکھا۔

پریم چند نے سرشار کی طرح ہی انسانی جذبات کی صحیح عکاسی کی۔ انھوں نے بھی گوشت پوست کے انسان ترلشے، بت نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر سرشار نے "فسانۂ آزاد" نہ لکھا ہوتا تو پریم چند کو زبان و بیان اور محاورات کے برمحل اور عمدہ استعمال کا سلیقہ نہ آتا اور کردار نگاری منظر کشی اور طنز و مزاح کی گرفت بھی مضبوط نہ ہوتی دوسرے لفظوں میں یوں کہیے اگر سرشار نہ ہوتے تو پریم چند بھی نہ ہوتے اور اس صورت میں ذرا سوچیے ہمارا آج کا ناول اور افسانہ کہاں ہوتا؟

ضمیمہ

فسانۂ آزاد جلد اوّل

سرشار کی تحریروں کے نمونے

بسنت کی بہار

بہارِ باغ کا عالم خطِ گلزار میں مستور ہے۔ صفحۂ قرطاس نورعلی نور ہے۔ گلزارِ دلستاں ہیں کہ جنت کے چمن حور و غلماں ہیں یا نسرین و نسترن۔ فردوسی آئے تو گلچیں ہو جائے۔ رضواں دیکھے تو شرمائے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی ٹھنٹھرن۔ بادِ بہاری کے جھونکے سنا سن۔ سبزے کی لہک گلِ جعفری کی مہک۔ کلیوں کا چٹکنا، پھولوں کا مہکنا، شاخِ گل کی کج ادائی۔ سنبل کی آشفتگی۔ گلوں کی رعنائی۔ دُزدیدہ نگاہوں سے نرگسِ شہلا کی نظارہ بازی۔ زبانِ حال سے سوسن کی زبان درازی شاخِ گل کا مستانہ وار جھومنا، اشجار پر میوہ کا زمین کو بار بار چومنا۔ سنبل کی سیہ مستی۔ نرگس کی جام پرستی، نونہالانِ چمن کے ہاتھوں میں پھولوں کے جام، جیسے زندانِ مئے آشام۔ منقار بلبل نغمہ خیز، نامے موسیقار ترانہ ریز۔ طوطی کی خوش بیانی۔ عنادل کی غزل خوانی کوئل کی کوکو۔ قمری کا نعرۂ حق۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

ایسی کثرت سے جو ہو بارشِ بارانِ بہار
زاہدِ خشک کا ممکن ہے نہ ہو تر دامن

پھولوں سے لبریز گلچینوں کی جھولی ہے۔ باغباں کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ حوضِ باغ آئینے کی صورت صاف، پانی مثل بلّور شفاف۔ روشیں صاف و پاک۔ پٹریاں بے خس وخاشاک، رنگیلے جوبن نشۂ گل گشت میں مخمور، بادۂ مسرت سے چور، لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ زعفران زار ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بسنت کی بہار ہے۔ یوں تو ہر سمت طبلے پر تھاپ، سارنگی کی چھیڑ چھاڑ اور نغمہ سرائی کا انتظام ہے۔ مگر شاہ مینا صاحب کی درگاہ سب میں انتخاب زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔ اللہ اکبر گردِ مزار۔ کہیں نوجوانوں کی دھوم دھام ہے کہ جس طرف دیکھیے اژدہام عام ہے۔ غٹ کے غٹ۔ جوق کے جوق چلے جاتے ہیں۔ غول کے غول امڈے آتے ہیں۔ وہ بھیڑ بھڑکا۔ وہ دھکم دھکا۔ وہ ریل پیل، وہ شور وشر کہ الاماں والحذر۔ ایک دوسرے کو ریلتا ہے۔ دوسرا تیسرے کو ڈھکیلتا ہے۔ ڈولیوں پر ڈولیاں اور فنس پہ فنس چلی آتی ہیں۔ مہ جبینانِ ماہ رو قماش بینوں کی بدولت گلچھرے اڑاتی ہیں۔ قدم بھر چلنا دشوار۔ سر پر خاک چہرے پر غبار۔ مزارِ شریف کے گرد جابجا گل رخان سنبل مو عجب ناز وانداز سے جلوہ گر۔ جسے دیکھو طرحدار، ہلالِ ابرو رشکِ قمر۔ صندلی رنگ شوخ و سنگ پوشاک از سرتاپا دھانی۔ دوپٹہ ہلکا زعفرانی۔ خوش بو۔ خوش رو۔ خوش خو۔ مرغولہ مو، آئینہ زانو نازک اندام نازنین، حور لقا زہرہ جبیں، شوخ و بیباک، چست وچالاک، خوش الحان غزلخواں، گوہر یاقوت لب، یمن گاتی ہے، دل بہار گل عذار بہار کی تان اڑاتی ہے۔ عجب ناز وانداز سے کھڑی، ہاتھ سارنگی والے کے کاندھے پہ دھرے۔ کمر کو لوچ دیے

(رُت آئی بسنت عجب بہار) کی تان اُڑا رہی ہیں۔ اشارے میں سارے نکتے سربستہ بتا رہی ہیں ہر ایک تان جالستاں۔ تان سین کی روح جس پر قربان۔ نور کے گلے نور کی آواز۔ بلا کا تاز قہر کا انداز مطرب کی ناخن بازی پر دل لوٹ ہے۔ اربابِ نشاط کے رقص اور ٹھوکر سے کلیجے پر چوٹ ہے۔ رقص کا وہ سماں بندھا کہ عاشقوں کا دل بھی گنگنانے لگا۔ (ص۔ ۴۱۔ ۴۲)

فسانۂ آزاد (جلد اوّل)

اکڑفوں

میاں آزاد زمین کے گز بنے۔ اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کہ اتنے میں ایک بڈھے کھوسٹ نے ایک بانکے سے کہا کہ میاں بیدھے آئے ہوئے یا جان وبال ہے یا زندگی دوبھر ہے یا چھینکتے گھر سے چلے تھے۔ یہ اکڑنا اور بررنا کیا معنی؟ یہاں گردن جھکا کر چلا کیجیے ورنہ کوئی پہلوان گردن ناپے گا تو یہ شیخیت ساری خاک میں مل جائے گی۔ تننّا اور ایڈنا بھول جائیے گا۔ مفت میں کرکری ہوگی۔ اس سے کیا واسطہ۔ یہ شہر کشتی۔ پیتے۔ بانک لکڑی کی ٹکسال ہے۔ بہت سے لڑنتیے آئے مگر پٹخنی کھا گئے۔ ہاتھ ملاتے ہی یہاں کے پہلوان پکڑ لائے اور مارا چاروں شانے چت۔ ٹنگڑی پر اڑانے میں طاق، سواری کسنے میں مشّاق، کولھے پر لادنے میں بزاق۔

یہ سُنتے ہی وہ میاں بانکے آگ بھبوکا ہوگئے۔ جی تو کہیں

اس بھروسے پر نہ رہیے گا۔ بندہ پٹخنی کھانے والا آدمی نہیں ہے
بیچ کھیت پچھاڑوں تو سہی۔ قربان اپنے استاد کے۔ جنھوں نے
ہمیں لکڑی سکھائی۔ ٹالوں کی لکڑی پھینکنا تو سب ہی جانتے ہیں۔
مگر میدانِ کارزار میں ٹھہرنا البتہ کارِ دارد اور زبانی داخلہ تو اور ہی
بات ہے۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں سے گہار لڑتے تھے
اور کون لوگ ایسے تیسے گنوار گھامڑ نہیں۔ پڑھے ہوئے پھٹے جن
پر اُن کو ناز تھا۔ پھر یہ خیال کیجیے کہ تیس گتکے برابر پڑتے تھے۔
مگر تیسوں کی خالی جاتی تھیں۔ کبھی آڑے ہوگئے۔ کبھی گتکے سے
چوٹ کاٹ دی۔ کبھی بدن کو سمیٹ لیا۔ کبھی پینترا بدل دیا۔ شاگردوں
کو للکارتے جاتے تھے کہ لگا بڑھ کے ہاتھ آگھس کے اور وہ جھلّا
جھلّا کے چوٹیں لگاتے تھے مگر منھ کی کھاتے تھے اور اپنا سا منھ
لے کر رہ جاتے تھے۔ جب سب کا دم ٹوٹ گیا اور لگے ہانپنے تو
گتکے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑے۔ مگر واہ رے اُستاد۔ اُن کے
وہی خم دم۔ وہی چتون۔ وہی تاؤ بھاؤ۔ پہروں لکڑی پھینکیں لیکن
دم نہ پھولے اور جو کہیں بھڑ پڑے تو بات کی بات میں پرے صاف
تھے۔ کسی پر بالسٹ کا ہاتھ جمایا۔ کسی کو چاقو کا ہاتھ لگایا۔ پھر بھی یہی
معلوم ہوتا تھا کہ پھلجھڑ چھوٹ رہی ہے یا آتش بازی کی چھچھوندر ناچ
رہی ہے (استاد کی اچھی تعریف کی) یا چرخی چکر میں ہے۔ جنیو کا
ہاتھ تو آج تک کوئی چار دانگِ عالم میں روک ہی نہ سکا۔ وہ تُلا ہوا
ہاتھ پڑتا تھا کہ ادھر اشارہ کیا ادھر تڑ سے پڑ گیا۔ جنیو کا ہاتھ کیا تفنگ
مبرم ہے پیامِ اجل ہے۔ (ص ۱۶۷

سیرِ کہسار (جلد دوم)

لاڈو ۔ حضور اللہ کرے ۔خیر صلاح سے پہنچ جائیں تو ہم اب کی ڈے (جمعہ) کو سید جلال کا کونڈا کریں گے ۔
بیگم۔ اپنے اپنے خیال کے موافق سب نذر و نیاز کرتے ہیں۔
مغلانی۔ حضور، یہ سب اُس موئے جمن کی شرارت تھی۔
لاڈو ۔ اے ہے۔ یہ تم کیا کہتی ہو۔ بوا جمن کی تو جان کھسکتی ہے پہاڑ جاتے ہوئے ۔ یہ مرزا نے کہہ کہ اسے پہاڑ پر بھجوایا۔
بیگم۔ میرا بس چلے تو موئے کا کورے اُسترے سے سر مُنڈوا دوں۔
مغلانی۔ حضور، یہ لونڈی کاٹیے تو اپنے ادھر کے فائدے کے لیے رئیسوں کی آبرو پر پانی پھیر دیں۔
بیگم۔ جمن کا تو نواب کے دربار میں سکندر نعیبہ ہے۔
مغلانی۔ بس حضور یہاں کے شہزادوں میں ایک وہ چھتے والے تو راہ راہ چلتے ہیں۔ دیکھ بھال کے۔ باقی تو اور سب لکھ لٹ ہیں۔
بیگم۔ کیوں منے مرزا نہیں دیکھ بھال کے چلتے ہیں۔
مغلانی۔ اوئی حضور نے کس کا نام لیا۔ اے وہ تو مکھی چوس ہیں۔
بیگم۔ کون ؟ منے مرزا۔ اے لو اور سُنو۔
مغلانی۔ اے بیگم صاحب آپ کے نمک کی قسم ایک جھنجھی تو خرچتے نہیں کہ جھنجھی فرچیں۔ کوئی پھوٹی کوڑی تو اُن سے لے لے۔
لاڈو۔ دل تو اللہ نے دیا ہے ہماری بیگم صاحب کو۔

مغلانی۔ کیا بات ہے۔ بیگم صاحب بڑی فیاض ہیں۔
لاڈو۔ کیا کہنا ہے۔ بیگم صاحب کی فیاضی مشہور ہے۔
بیگم۔ اب تو کہیں نواب کا خط آئے تو ہمارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے۔
مغلانی۔ اللہ کرے آج ہی آئے۔ رت جگا کیجیے گا۔
بیگم۔ ضرور ایسی بات ہے بھلا۔ (ص ۸۴-۸۳)

کرم دھم

بہ ہزار خرابی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی چھتوں ہی چھت ہنسوڑ گئی اور زینے کا قفل کھول کر دریا کی طرف آئی اور اشارے سے اُس کشتۂ تیغ ز اشہید تبسم ناز کو بلایا۔ بھوکا کیا مانگے دو روٹیاں باچھیں کھل گئیں۔ کشتی کو اس طرح جانب ساحل رواں کیا جیسے تشنگانِ حجاز آبِ شیریں کی جانب سانڈنی کو تیز کرتے ہیں۔ ادھر کوٹھی سے کل مستورات اور مہریاں اور کوکلا اور ماما اور خاص اور یہ اور وہ سب ملا کے زینے سے دروازے پر آئیں کہ دیکھیں ہنسوڑ کیا دل لگی کرتی ہے۔ کسی کو خوف تھا کہ مبادا کشتی سے اُتارے اور نامحرم کو یہاں دھنسادے۔ کوئی کہتی تھی ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ کشتی پر بیٹھ کے تھوڑی دیر ہوا کھا آئے۔ غرضیکہ وہ بےچارہ بڑی آرزو کے ساتھ کنارے پر آیا اور کلیجہ ہاتھ بھر کا ہوگیا۔ وہ پری چہرہ معشوقہ دیکھنے میں آئے گی جس کی ایک ایک ادا سے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ خوش تھا کہ گود میں

کھوپڑی چٹخی مگر محنت رائگاں نہ گئی۔ اب اس جلتی جلتی دھوپ کے عوض خسخانہ و برفاب ملے گا خسخانہ اور برفاب سے بڑھ کر یہ ہوگا۔

وہ پری سے لے کے ساتھ سوؤں گا

حور جس کا پلنگ کستی ہے

صبح کو ایک برہمن سے پوچھ کے آئے تھے کہ ہم جس کام کو جاتے ہیں۔ اس میں مطلب نکلے گا یا محروم آئیں گے۔ اس نے پوتھی بچار کے پرشن دیکھ کر حکم لگایا تھا کہ مُراد پوری ہوجائے گی۔ اور دو روپے بھی ان سے اینٹھے تھے اور ساعت بھی بتائی تھی۔

(ص ۴۷-۴۸)

پی کہاں

اب وہاں کا حال سنیے ایک بڑے دیوان خانے میں ڈاکٹر بیٹھے ہوئے اسی میں ایک پلنگ بچھا ہوا۔ بستر صاف سُتھرا۔ عطر اور گوگل اور اگر کی بتی اور پھولوں کی خوشبو سے مکان بھر مہک رہا تھا۔ لیمپ روشن، سب لیمپوں پر ہرا شیڈ۔ گھر کی خادمائیں ادب کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑی سب خاموش دوائی کی شیشیاں اور بوتلیں اسی دیوان خانے میں ایک طرف چُنی ہوئیں۔ اُس پلنگ پر جس پر راجہ راحت حسین آرام کرتے تھے عورتوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کوئی پوچھتی تھی۔ بھیا ہم کو پہچانتے ہو۔ کوئی کہتی تھی "ڈاکٹر صاحب" میں لونڈی ہوجاؤں گی۔ اِن کو کوئی ایسی دوا دیجیے کہ باتیں کرنے لگیں۔ کسی نے رو کر

کہا یا الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے۔ مردوں میں سوائے دیوان کانجی مل اور ڈاکٹر اور خواجہ سرائے اور کوئی نہیں۔ کانجی مل اور ڈاکٹر سے اس پریشانی کے عالم میں کسی نے پردہ نہیں کیا۔ جان پر بنی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب واقعی جان پر کھیل گئے۔ جان لڑا دی۔ باہر دو سو سیدوں کو کھلایا گیا۔ ایک طرف لنگر بٹ رہا تھا۔ دوسری طرف فقیروں کو کھانا اور کپڑا دیا جاتا تھا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب قافلہ داخل نہیں ہوا تھا۔ جب یہ قافلہ داخل ہوا۔ اور یہ لوگ آئے۔ فوراً باغ اور املاک بھر میں پردہ کرا دیا گیا۔ اب صرف ڈاکٹر بیٹھے تھے۔ کانجی مل باہر چلے گئے۔ نورجہاں اپنی پریشانی، رنج اور غم بھول گئی۔ ایک ایک قدم پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک جان کی جگہ ہزار ہزار جانیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ دل باغ باغ۔ بڑی بیگم نے کہا۔ مجھے تو دوبارہ زندگی ملی۔ نظیر بیگم بولیں:" امی جان نے دوبارہ زندگی پائی۔"

(ص ۶۰) (ہندی سے)

ہشو

میاں چپئی تو دنیا کے ہاں دہی بڑے بھی لے رہے ہیں اور چکھ بھی رہے ہیں۔ لالہ اپنے گھر لمبے ہوئے۔ گھر سے نوکر بلایا چراغ جلوایا۔ ارے ہائیں۔ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ خالی شراب کے نالے بہہ رہے ہیں۔ مستھوروں کو کوٹھری میں دیکھا تو ٹوٹی ہوئیں۔ دریا بہہ رہے ہیں۔ سر پیٹ لیا۔ بڑا غل مچایا۔ ارے لُٹ گیا۔ مر مٹا۔ آس پاس کے لوگ آئے۔ دیکھتے ہیں تو مستھوریں

اور بوتلیں اور پیپے سب ایک سرے سے زخمی اور مارے بُو کے
رہا نہیں جاتا اور شراب کا یہ حال کہ دریا بہتا ہے۔ اندر باہر شراب
ہی شراب۔ سب کو رنج ہوا۔ پوچھا "یہ کیا ہوا بھئی" انھوں نے کہا
" ہوا کیا۔ ہماری بدنصیبی۔ ہماری نحوست۔ دنوں کی گردش۔ اور صاحب
کیا پوچھتے ہو۔ ایک لالہ آئے تھے۔ ہم اُن کے واسطے فالسے والی
لینے گئے تھے۔ امیر آدمی تھے۔ ہم نے کہا بھائی ان کی تعظیم و تکریم
کریں۔ چپیّ سے کہہ گئے کہ ان کو جب لگ کندی پلاؤ۔ یہاں آئے
تو دیا گل۔ دوکان میں اندھیرا پڑا ہوا۔ ہوش اُڑ گئے۔

ارے یہ کیا بھیا۔ دیا جلایا تو بوتلیں ٹوٹی ہوئیں۔ ارے پیپا جو
دیکھا یہ اوندھا پڑا ہوا۔ جان نکل گئی۔ کوٹھی میں مٹھوریں سب ٹوٹی
پھوٹی۔ نہ لالہ کا پتہ نہ چپیّ حرام زادے کا۔ ایک آدمی نے کہا۔ چپیّ
کو تو ہم نے چوک میں دیکھا تھا۔ لالہ کو اور بھی حیرت ہوئی کہ اتنے
میں چپیّ آیا اور اِکّے سے اترا اور لالہ نے دوڑ کے ایک لوٹا
زور سے دیا۔ ارے تو تھا کہاں۔ حرام زادے! دوکان لٹا دی۔
اب اس کا خرچہ کون دے گا۔ (ص ۷۴-۷۵) (ہندی سے)

فسانۂ آزاد (جلد اوّل)

برات کی دھوم

ایک رئیس گردوں مدار و امیر با وقار کی ایک دختر فرخندہ اختر
تھی۔ رئیس موصوف نے اُس کو بہ ناز و نعم پالا۔ جب لڑکی کچھ سیانی
ہوئی تو اس کی شادی کی فکر پیدا ہوئی۔ بڑے بڑے نام برآوردہ

دو سا وذی الاقتدار کے یہاں سے پیغام آنے لگے۔ دور دور تک
اس کے حسن وجمال کی شہرت ہوئی۔ آخر کار ایک رئیس والا تبار و
جم اقتدار کے ساتھ نسبت قرار پائی۔ پھر کیا تھا طرفین سے تیاریاں
ہونے لگیں۔ اب شوق کی اس درجہ افزائش کو جی چاہتا ہے سب
جمع جتھا لٹا دیں۔ آنکھ بند کر کے خرچ کرنے لگیں۔ ایک نے اسّی
ہزار روپے قرض لیے۔ دوسرے نے تعلقے کے کوڑے کیے۔ دونوں
لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے لگے۔ خدمت گاروں، ماماؤں، اصیلوں، نوکروں
چاکروں نے بیش بہا جوڑے پھڑکائے۔ خوب انعام وخلعت پائے۔
برات کے دن بڑے کروفر سے برات بجی گئی۔ دونوں طرف خوب
ٹھاٹھ تھے۔

یاں جلوہ فروش تخت وطاؤس
الماس کے واں تھے جھاڑ وفانوس

یار چرنی ہے چرخ میں سرعرش
مہتاب چاندنی کا واں فرش

گل رنگ کسی کا تھا ہوا دار
گل گوں تھا کسی کا باد رفتار

گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھی
ہاتھی تھے تو مستیوں کی دھت تھی

تھا پا بہ رکاب شوق مہمیز
وہ ماہ کہ تھا سوار شب دیز

سب سے پہلے نشان کا ہاتھی۔ شب رنگ صورت دیکھے انسان ڈر
جائے۔ اس کے بعد بڑی دور تک جلوس کی بہار اور سانڈنیوں کی
قطار تھی۔ عربی، ترکی، تازی۔ ویلا۔ کیگ۔ الواع واقسام کے رہوار
باد رفتار۔ خوش خرام وتیز گام۔ سجے سجائے۔ پرے کے پرے جمائے
چاندی کا گہنا پہنے۔ دلہن کی ایسی صورت بنائے۔ چھم چھم کرتے چمکتے
جاتے ہیں۔ آرائش کے تخت بڑے صناعان چابکدست کے بنائے

ہوئے بلطفِ جلوس دوبالا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گلزارِ ارم کے پھول پھولے ہیں۔ سرو بنایا تو نقل کو اصل کر دکھایا۔ چانڈو بازوں کا تخت قابلِ دید تھا۔ کوئی نشے میں جھوم رہا ہے۔ کوئی نئے کو چوم رہا ہے۔ کوئی گرمٹ تھامے عین ہے۔ کوئی کتارا چوستا ہے بعینہ چانڈو خانے کی تصویر کھینچ دی۔ جزیرے کا پتلی کا تخت رہسیہ منڈل دیکھنے سے دل کو سرور ہوتا تھا۔ سواروں کا تخت ستم ڈھاتا تھا۔ سوار خاکی وردیاں پہنے، کرچ لٹکائے، گھوڑے کی باگ اٹھائے۔ دھاوا بولا ہی چاہتے ہیں۔

(ص ۳۱-۳۲)

کتابیات

۱۔ مضامین چکبست — پنڈت برج نرائن چکبست
۲۔ یادِ رفتگاں — جگرؔ بریلوی
۳۔ تاریخ ادب اُردو — رام بابو سکسینہ
۴۔ خم خانۂ جاوید (جلد چہارم) — لالہ سری رام
۵۔ فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرورؔ
۶۔ بہارِ گلشنِ کشمیر — جگ موہن ناتھ رینہ شوقؔ اور پنڈت برج کشن
۷۔ دورِ جدید کے چند ہندو شعرا — عبدالشکور
۸۔ پریم چند — ہنس راج رہبر
۹۔ فیمس اردو لائٹرز اینڈ پوئیٹس — سر عبدالقادر
۱۰۔ ادب اور سماج — سیّد احتشام حسین
۱۱۔ فسانۂ آزاد (چار جلدیں) — رتن ناتھ سرشار
۱۲۔ سیرِ کہسار (دو جلدیں) — "
۱۳۔ جامِ سرشار — "
۱۴۔ طوفانِ بے تمیزی — "